پاکدامنی کو اسلامی تمدن کی اہم خصوصیات بتا کر مغربی تمدن سے اس کا فرق و تضاد واضح کیا ہے، شروع میں مولانا نے اسلام کے خاص مزاج اور ان نمایاں خصوصیات کو بیان کیا ہے، جن پر اس کی شخصیت اور نمو و بقا کا انحصار ہے اور جو اسے دوسرے مذاہب اور فلسفوں سے ممتاز کرتی ہیں، اس سلسلہ میں عقائد کی اہمیت خاص طور پر واضح کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان کے اور اپنی دعوت و پیغام کے معاملہ میں انبیاء علیہم السلام نے کوئی مفاہمت، مداہنت اور ترمیم وغیرہ کبھی گوارا نہیں کی، آخر میں فاضل مصنف نے دین کے مزاج، اس کی امتیازی خصوصیات ایمانی اوصاف اور اسلامی اخلاق سے آراستہ زندگی اختیار کرنے کے لیے اپنے زرین مشورے اور بیش قیمت اور مفید تجربے بیان کیے ہیں، جن پر اگر واقعی عمل کیا جائے تو اسلام کو مطلوب عقائد، اعمال اور اخلاق مسلمانوں کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں، یہ مفید کتاب دراصل مسلمانوں کے نظام زندگی کا خاکہ اور ان کا دستور العمل ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، مولانا نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی ان کے لائق اور ہونہار عزیز مولوی سید سلمان حسینی ندوی نے اس کا انہی کے طرز و اسلوب اور رنگ و آہنگ میں ایسا رواں، سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اس پر طبعزاد ہونے کا گمان ہوتا ہے،

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ارمغان حرم :- مرتبہ جناب عبدالرحمن محسن انصاری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت چار روپیے پتہ: مکتبہ اسلامی، ۳۱، سی، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

جناب محسن انصاری ادیب و شاعر بھی ہیں اور دیندار مسلمان بھی، وہ حج و زیارت کعبہ کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں، قطعات کا یہ مختصر مجموعہ اس سفر کی یادگار اور سوغات ہے جو محسن صاحب کے تاثرات و مشاہدات اور قلبی واردات و کیفیات پر مشتمل ہے اس سے ان کے ایمانی جذبات و احساسات، سوز و گداز قلب کے علاوہ شعری حسن و جاذبیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۳ء عدد ۵

مضامین

مقالات

اسلام اور مستشرقین کی بیرونی ڈاک

شذرات

گذشتہ مہینے معارف میں ذکر آیا تھا کہ اپریل میں کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے سعدی شیرازی پر ایک سمینار ہونے والا ہے، اس میں شریک ہو کر بہت محظوظ ہوا،

معارف کے صفحات میں بارہا ذکر آیا ہے کہ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی علمی سرگرمیوں سے وہاں کے ہر طبقہ کے لوگوں کو دلچسپی ہے، توقع کے مطابق سعدی شیرازی سے مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور پارسیوں نے پوری دلچسپی دکھائی، اس کا افتتاح بہار کی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر جناب رادھا نند جھا نے کیا، ایک بنگالی ہندو اہل علم جناب اس، بی، رے نے سعدی کی ایک فارسی نظم ہم نشینی کا ترجمہ بنگالی زبان میں سنایا، ایران سوسائٹی کے سابق صدر دسی، بی، گمی موقع بموقع سعدی کو برابر خراج عقیدت پیش کرتے رہے، ڈاکٹر تاراچند سابق وزیر تعلیم حکومت ہند نے سعدی کی انسان دوستی اور آفاقی محبت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی تصانیف کے کچھ ترجمے بنگلہ زبان میں بھی ہوئے ہیں، راجستھان یونیورسٹی کے استاد جناب دھرمیندر ناتھ کو سعدی کے بہت سے اشعار اور گلستاں کے بہت سے جملے ازبر تھے، انھوں نے اپنے مقالہ میں گلستاں اور پنج تنترا کا موازنہ بھی کیا، ایران سوسائٹی کی طرف سے جو سونیر تقسیم کیا گیا، اس میں مغربی بنگال کے ایک نوجوان مصور وسیم ریاض کی بنائی ہوئی ایک شبیہ بھی تھی،

سمینار میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی بڑی اچھی نمایندگی تھی، علی گڑھ سے ڈاکٹر نذیر احمد، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نور الحسن، جواہر لال یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالودود اظہر،

اور ڈاکٹر محمود عالم، کشمیر یونیورسٹی سے پروفیسر شمس الدین، عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر شریف النساء، وشوا بھارتی یونیورسٹی سے ڈاکٹر حافظ محمد طاہر، بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹر مجتبیٰ انصاری، الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مرتضیٰ اور آسام یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالقادر جعفری آئے، کلکتہ یونیورسٹی کی نمایندگی جناب ڈاکٹر عطا کریم برق کے علاوہ پروفیسر مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمد امین اور ڈاکٹر محمد فیروز نے کی، ظاہر ہے کہ ایسی نمایندگی کے بعد سمینار کا کامیاب ہونا ضروری تھا، ایرانی سفارت خانہ کے نمایندوں آقائے بیدار منزہ اور آقائے ذو الانوری کی وجہ سے اس کی کامیابی میں مزید اضافہ ہوا، مغربی بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم اس کے وزیر جناب ابو المنصور حبیب اللہ، کلکتہ کی ممتاز خاتون لیڈی مکرجی اور شہر کے دوسرے اکابر کی تشریف آوری سے اس کی رونق اور بڑھی،

ایران سوسائٹی کے ہر کارکن کو یہ فکر تھی کہ سمینار اس کے دیرینہ معیار کے مطابق کامیاب ہو، جہاں اس کے صدر جناب خواجہ محمد یوسف صاحب اپنی خندہ پیشانی، دل نوازی اور خاطر داری کے خزانے بکھیرتے رہے، وہاں اس کے جنرل سکریٹری محمد مجید صاحب اپنی مستعدی اور [illegible] کے ساتھ ہر طرف دکھائی دیتے رہے، ان میں ایک گلستاں تو دوسرا بوستاں بنا رہا، اس میں جناب ابو علقمہ شبلی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے اپنی برمحل نظموں سے سامعین کو محظوظ کر کے داد حاصل کی، ذہنی ضیافتوں کے ساتھ کام و دہن کے لذت آشنا ہونے کا سامان بھی رہا، جس میں حاجی عبد القیوم مالک امینیہ ہوٹل کا پرتکلف لنچ اور جناب روسی گمی کی طرف سے لذیذ اور خوش ذائقہ الوداعی ڈنر خاص طور پر قابل ذکر ہے،

اس سمینار میں ڈاکٹر نذیر احمد نے اس پر اظہار افسوس کیا، کہ ایران و ہندوستان کا سعدی پر جس خاطر خواہ طریقے پر تحقیقی کام ہونا چاہئے تھا، وہ اب تک نہیں ہو سکا ہے،

ایرانی سفارت خانہ کے ایک نمایندہ کلیات سعدی کا ایک ضخیم اڈیشن برابر دکھاتے رہے، مگر اس سے اطمینان نہ ہوسکا، ہندوستان میں غالب اور اقبال پر گذشتہ سو سال کے اندر جتنا کام ہوا ہے، سعدی پر آٹھ سو سال میں اتنا کام نہیں ہوسکا ہوگا حالانکہ سعدی کی مقبولیت کی عالمگیریت اور آفاقیت مسلّم ہے، ان کی وفات کب ہوئی، انھوں نے واقعی کتنی عمر پائی، انھوں نے کن کن اساتذہ سے تعلیم پائی، ان کے معاصرین کون کون تھے، ان کی ملاقاتیں کن کن معاصرین سے ہوئیں وغیرہ، اس قسم کی مستند معلومات نہ ہونے کی وجہ سے مقالہ نگاروں سے اگر غلطیاں ہوجائیں، تو تعجب انگیز نہیں، اس سمینار کے مقالوں کا مجموعہ شائع کیا جائے گا، تو سعدی شیرازی سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات فراہم ہوجائیں گے، جو ایران سوسائٹی کلکتہ کی زریں کلغیوں میں ایک کا اور اضافہ ہوگا،

کھلے اجلاس میں تو نہیں لیکن نجی گفتگوؤں میں گلستاں کا باب پنجم زیر بحث رہا جس میں عشق و جوانی کے نام سے بعض ایسے مذموم اور قبیح واقعات لکھے گئے ہیں، جو ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں، اخلاقیات کی اس عدیم المثال کتاب میں اس باب کی کیا ضرورت تھی، خصوصاً جب سعدی خود لکھتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات بخت نافرجام و عقل ناتمام کے نتیجے ہوتے ہیں، شاید سعدی نے یہ سب کچھ لکھ کر اپنی طبیعت کے اس رنگ کا ثبوت دیا، کہ "مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت" یا ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے انھوں نے اپنے زمانے کے معاشرے کے ان پھوڑوں پر جراحی کا فرض انجام دینے کی کوشش کی ہو، کیونکہ ان کو خود اعتراف ہے کہ ان کی گفتار کی طرب انگیزی اور طیبت آمیزی طعن درازی کی علت بن جائے گی، مگر اس سے بے فکر ہو کر انھوں نے تلخ نصیحت کے دارو

کو ظرافت کے شہد میں اس لیے لایا کہ طبع ملول دولت قبول سے محروم نہ ہو، پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ سعدی نے اپنے باب پنجم کی نثر میں جو کچھ لکھا ہے، اسی کی آواز بازگشت فارسی اور اردو شعراء کی غزلوں میں برابر سنی گئی، اسی ذوق کے علل و اسباب کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے،

سمینار کے بعد کلکتہ میں مزید ایک ہفتہ قیام رہا۔ دارالمصنفین کے لائف ممبر جناب حاجی منظور علی صاحب مالک رائل ہوٹل نے میری اور میرے رفقاے کار مولوی ابوالبقا ندوی اور حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی کی خاطرداری اور مہمان نوازی کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی، وہ دارالمصنفین کے قدرداں ہونے کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بڑے پرستار ہیں، اُن کی کتابوں کو عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع کرکے ان کی اہمیت اور افادیت کو عام کر رہے ہیں، ان کے گھر پر منتخب کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ بھی ہے جس سے ان کی خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ ایک رات کلکتہ کے مشہور علاقہ چورنگی سے گذرا تو اس کی بے رنگی دیکھ کر دکھ ہوا کہ اب اس کے حسن کی ساری رنگارنگی جاتی رہی، اب مشکل ہی سے زبان پر یہ شعر آئے،

شہرے بہ ادائے کلکتہ ندیدم　　دیدم بہ جہاں شہر بسے خرم و آباد

کلکتہ کے مشہور طبیب جناب مولانا محمد زماں حسینی صاحب کی پرکیف صحبتوں اور ان کی عالمانہ گفتگوؤں سے برابر محظوظ ہونے کا موقع ملا، ان کے صاحبزادے مولوی محمد عرفان الحسینی سایہ کی طرح ساتھ رہے، پروفیسر مقبول احمد اور پروفیسر مجیب الرحمن نے قیام گاہ پر آکر اپنی علمی باتوں سے مجلس گرم کی، جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر روزنامہ آزاد ہند عزیزانہ محبت سے پیش آئے، اپنے اخبار میں دارالمصنفین کی علمی خدمات کو نمایاں کرکے ممنون کیا، ان کا اخبار اب انگریزی اخباروں کی طرح بڑے سائز میں آفسٹ پر چھپتا ہے،

ان کے دفتر کی نئی بلند اور مزین عمارت دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اردو صحافت نگاری اب بھی اپنا اعجاز دکھا سکتی ہے، وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول ہیں، کلکتہ سے ایک دوسرا روزنامہ اخبار مشرق بھی آب و تاب سے آفسٹ کی چھپائی کے ساتھ نکلتا ہے، اس کے جواں ہمت اڈیٹر جناب محمد وسیم الحق برابر قیام گاہ پر آتے رہے، ان کی برق روشی مستعدی اور تن دہی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگر اردو صحافت نگاری اچھے اور مخلص لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، تو اس کا مستقبل ملک کے اور اخباروں کے ساتھ کم روشن نہیں، اس کے اداریے جناب احسن مفتاحی بھی لکھا کرتے ہیں، جن کے قلم میں زور کے ساتھ صحافت نگاری کی متانت بھی ہے، اس اخبار کے ذریعہ سے بھی دارالمصنفین کی علمی خدمات وہاں کے لوگوں کے سامنے آئیں، اس کے دفتر کی کارکردگی کو دیکھکر مسرت ہوئی، خدا کرے کلکتہ کے یہ دونوں اخبار اپنی اچھی اور متوازن صحافت نگاری سے مغربی بنگال کے مسلمانوں کی مفید خدمات انجام دیتے رہیں، مسلمانوں میں اس وقت مؤثر قیادت اور تنظیم کی بڑی کمی ہے، اس کو اردو کے اخبارات ہی اپنی طاقتور صحافت نگاری سے پورا کر سکتے ہیں،

مغربی بنگال کی اردو اکیڈمی دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا، یہاں سے جو کتابیں اچھی کتابت اور طباعت سے شائع ہو رہی ہیں، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں، صلیبیں میرے دریچے میں، مضامین وحشت، سبزۂ گل، اردو ادب اور بنگالی کلچر، میزان، افسانے، سطح آئینہ، پھول آنگن کے، اور میر باقر مرشد آبادی وغیرہ، اس کی طرف سے کتابت کا ایک اسکول بھی کھلا ہوا ہے، اس کے طلبہ کو ڈیڑھ سو ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، اور اس کے اساتذہ کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہے، اکیڈمی کے کتب خانہ میں پندرہ ہزار اردو کی کتابیں جمع کر لی گئی ہیں،

ذکریا اسٹریٹ میں محمد علی لائبریری ہے، اس کے سرگرم سکریٹری جناب محمد جلیل صاحب نے اپنی کوششوں سے اس کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا ہے، ایک شام یہاں بھی مدعو تھا، مولانا محمد علی جوہر سے بڑی والہانہ عقیدت ہے، اس لئے ان پر بولنے کا موقع ملا تو دیر تک اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا، اس کے کتبخانہ میں بھی اردو کی بہت سی کتابیں جمع کر لی گئی ہیں،

حکومت مغربی بنگال کے لائق وزیر جناب ابو المنصور حبیب اللہ سے معلوم ہوا کہ اس ریاست میں اردو میڈیم کے چالیس ہائی اسکول ہیں، خود کلکتہ کے کئی اسکولوں میں ہائی اسکول کی تعلیم اردو میں ہوتی ہے، انجمن مفید الاسلام کے ایک ہائی اسکول میں لڑکیوں کی تعلیم صرف اردو میں ہوتی ہے، اس میں بنگلہ زبان مطلق پڑھائی نہیں جاتی ہے، اس انجمن کے سکریٹری جناب غلام رسول صاحب میں بڑی مذہبیت ہے، اس لئے اس اسکول میں پردہ اور مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام کیا ہے، اس کی پرنسپل مسز سالک صاحبہ نے عمرانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے، بہت اچھی علمی گفتگو کرتی ہیں، اس اسکول کو اسلئے بھی دلچسپی زیادہ ہوئی کہ اس کو قائم کرنے میں میرے عم محترم جناب سید صلاح الدین صاحب کا بڑا نمایاں حصہ ہے، اس کے موجودہ مخلص کارکنوں میں جناب محمد اسحاق عرف مولانا ہیں، جن کی دبی ہوئی علمی صلاحیتیں اب اچھی طرح ابھر رہی ہیں، کلکتہ کے جریدوں اور اخباروں میں اچھے مضامین لکھ کر نمایاں ہو رہے ہیں، اس محلہ میں اپنے ایک عزیز جناب منصور علی اور ان کے خاندان والوں سے شاید ساٹھ برس کے بعد مل کر بڑی خوشی ہوئی،

یہ معلوم کر کے خوشی نہیں ہوئی کہ جن ہائی اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے، وہاں کے طلبہ بنگالی زبان پڑھنے سے گریز کرتے ہیں، یہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں، ایک زبان کی حیثیت سے مسلمان طلبہ بنگلہ بھی ضرور پڑھیں، اس سے ان کو ذاتی، مادی، اقتصادی اور سرکاری فوائد بھی حاصل ہوتے رہیں گے، بنگال میں رہ کر وہاں کی اس ترقی یافتہ زبان سے ناواقف رہنا غیر دانشمندی ہے،

جناب حاجی غلام رسول صاحب نے اپنی مذہبی اور ایمانی حمیت کی وجہ سے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے کئی دینی مدارس کھول رکھے ہیں، ان کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، نرکل ڈانگہ اور چترنجن ایونیو میں ان کے مدارس میں ان کے بچوں کو بھی مخاطب کرنے کا موقع ملا، دعا ہے کہ وہ آگے چل کر اپنے مذہب کے خمیر اور سفیر بن کر رہیں، بنگلہ اسلامی پرکاشنی ٹرسٹ میں بھی جناب سید علی صاحب نے مدعو کیا، اس کی طرف سے بنگلہ زبان میں کلام پاک کا جو ترجمہ ہوا ہے اس کو دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی، یہاں سے بنگالی مسلمانوں کے لئے بنگلہ زبان میں جو کچھ چھپ

بڑے مفید رسائل اور کتابچے شائع ہوئے ہیں اُن کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس خدمت کو انجام دینے کی سخت ضرورت تھی جو اس ادارہ کی طرف سے جاری ہوا اللہ تبارک و تعالیٰ اس نیک کام میں ہر طرح برکت دے، کلکتہ کے اسلامیہ اسپتال کے ہر کمرہ کو جناب گلزار احمد نے بڑے شوق سے دکھایا، یہ کلکتہ کے مسلمانوں کا بہت بڑا فلاحی کارنامہ ہے، اس سے وہاں کے لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کو جو طبی سہولت حاصل ہوئی اس سے اس کے بانیوں اور کارکنوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہوں گی، دعا ہے کہ اس کار خیر کا چشمہ برابر جاری رہے، (آمین)

اس سفر میں جناب حاجی عبدالقیوم، جناب منظور علی، جناب مولانا حکیم محمد زماں حسینی، جناب محمد خلیل، جناب محمد اسحٰق اور مولوی محمد عرفان الحسینی کی مساعی جمیلہ سے حسب ذیل حضرات نے دارالمصنفین کی رکنیت دوامی قبول کی، جن کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں، (۱) جناب حاجی غلام رسول (۲) پروفیسر مقبول احمد سرحدی (۳) جناب گلزار احمد (۴) جناب حاجی منصور احمد (۵) جناب محمد صادق (۶) جناب فیضان احمد (۷) جناب محمد خلیل (۸) جناب مبارک حسین (۹) جناب محمد یوسف بخشی، جناب محمد خلیل، جناب حسن زماں اور ڈاکٹر محمد عتیق دریابادی نے معارف کے کچھ خریدار بنوا کر ممنون کیا

اس سفر کا تتمہ جناب خواجہ محمد یوسف صاحب ایڈوکیٹ (صدر ایران سوسائٹی) کے دولت کدہ پر ایک پر تکلف اور شیریں مجلس پر ہوا جس میں کلکتہ کے منتخب اہلِ علم کے درمیان مٹھائیوں کے انبار میں علمی گفتگو ہوتی رہی، پروفیسر عطا کریم برق صدر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے اپنی شیوا بیانی سے محظوظ کیا، اور جب حاجی منظور علی، حاجی عبدالقیوم اور خواجہ محمد یوسف صاحبان نے ہر قسم کے اخلاقِ حسنہ کے ساتھ اسٹیشن سے رخصت کیا تو ان حضرات اور کلکتہ کے دوسرے لوگوں کی خاطر داری کی یادیں رفیق سفر بنی رہیں، کلکتہ کے مشہور مضمون نگار جناب آغا رشید دہلوی آج کل وہاں علیل ہیں، اُن کی عیادت کرکے اُن کی صحت کی دعا کی، مولانا ابو سلمہ شفیع اور اُن کے لڑکے مولوی ابو طلحہ ندوی کی پذیرائی بھی یاد رہے گی،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ

حرفِ آغاز اسلام، اسلامی تاریخ اور امت مسلمہ کی رہبری کا سرچشمہ چونکہ قرآن مجید یعنی کلام الٰہی رہا ہے اس لیے اسلام اور مستشرقین کے مطالعہ میں بھی اگر اسی مرجع و مصدر کی جانب رجوع کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوگا، لفظ مستشرق کی لغوی و نحوی تفسیر و تحلیل کی جا سکتی ہے، اور باب استفعال سے خواص کی تعیین کے بعد استشراق پر جرح و تعدیل بھی ممکن ہے، مگر راقم الحروف اس پورے مسئلہ کو نئے زاویہ سے حل کرنے کی تائید میں ہے، اور وہ قرآنی زاویہ ہے، اگر آج بھی قرآن کریم امت مسلمہ کی فکر کا نقطۂ آغاز اور منتہا ہے پرواز بن جائے جس طرح قرن اولیٰ کے مومنین باصفا اور مخلصین لہ الدین کا تھا تو نہ صرف سیاسی و سماجی، معاشی و ثقافتی میدانوں میں فتح و فیروز مندی کا غلغلہ مچ سکتا ہے، بلکہ علوم و فنون اور سائنس میں بھی شادمانی و کامرانی کا مژدۂ جانفزا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ لا سکتا ہے، بعض احباب کو یہ تجویز عجوبہ معلوم ہو سکتی ہے، اور وہ یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم اور مستشرقین کا باہمی ربط کیا ہے؟" اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اسی ربط کے انکشاف کے بعد ہمارا سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور آج جو خلفشار علمی دنیا میں مستشرقین نے مچا رکھا ہے یا ان کے شاگردان رشید ان مسلم اعتذاریوں نے برپا کر رکھا ہے، اس کا علاج بھی ممکن ہے.

اگر قرآن کریم اسلامی نظام حیات کا منشور ازلی ہے تو اسے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔ قرآن میں امت مسلمہ کی ہدایت کے لیے بہت سے احکام نازل ہوئے، مسلم حکمرانوں اور دانشوروں نے جب جب ان احکام سے روگردانی کی، خسارہ میں رہے، اور زمانہ اس پر شاہد ہے، وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، امت مسلمہ کی حکومتوں کے لیے جو خارجہ پالیسی قرآن نے متعین فرمائی تھی وہ ہمیشہ برحق ثابت ہوئی، اور آج تو اظہر من الشمس ہے، علم و دانش، ریسرچ و تحقیق کے میدان میں بھی یہی پالیسی ازلی و ابدی حیثیت رکھتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ان احکام الٰہیہ کو نظرانداز کیا اور اس کی سزا پائی، علم و دانش کے میدان میں بھی احکامِ الٰہیہ کی سرتابی کے نتائج مختلف نہیں ہو سکتے۔

اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ امت مسلمہ کو یہ فرمان دیا تھا:

(الف) وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔ (البقرہ - ۱۲۰)	یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہدو کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے، ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے،
(ب) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (مائدہ : ۵۱)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرق یا مستشرقین کون ہیں، اور ان کی نسل کہاں سے چلی ہے؟ اس کا جواب بھی اظہر من الشمس ہے، مستشرقین روز اول سے آج تک یہود و نصاریٰ رہے ہیں، خواہ مشرق میں ہوں خواہ مغرب میں، آٹھویں صدیؑ سے ۱۹۸۳ء تک مستشرقین کی تاریخ محض مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی کی تفسیر و تعبیر رہی ہے، بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انھی آیات کی تعبیر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و دانش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزء اعظم رہا ہے، مسلم اعتذاری اسکول کے فیاض اراکین خواہ کسی قدر مستشرقین کے کارناموں کی تحسین پیش کریں، ان کی تقصیرات کو دامن عفو میں جگہ دے کر ان کو صدارت کی کرسی پر بٹھا کر انھیں ہار پہنائیں مگر وہ لَنْ تَرْضٰی کے معنی میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، انھیں حق ہے کہ ہمیں متقشف متعصب اور غیر منصف قرار دیں، مگر قرآن کے معنی میں تبدیلی کا انھیں حق نہیں، جس کی وسعتوں میں ازلیت ہے اور ابدیت بھی، قرآن کریم کے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہمیں چودہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی اس کے بغیر معنی لَنْ تَرْضٰی کی تشریح ممکن نہیں۔

اسلام اور مستشرقین : ابتدائیہ فرمان الٰہی یعنی اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ عقائد اسلامیہ کا نقطۂ آغاز رہا ہے، اور منتہائے پرواز بھی، یہ تحریک حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمد صلعم

(۵۷۰ - ۶۳۲ء) پر ختم ہوئی، ایک طرف تکمیل دین (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) کا منشور جاری ہوا، دوسری طرف یہ اعلامیہ بھی جاری کر دیا گیا کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ کے لیے مقبول نہیں، وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (آل عمران ۸۵)
نیز ہر مومن کا شعار ہے کہ من حیث مسلم اپنے خالق اور باری کے دربار میں واپس ہو وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ، (آل عمران - ۱۰۲) اسلام کی یہ داخلی اور خارجی پالیسی یہود و نصاریٰ کے لیے ہمیشہ ناقابل قبول رہی، اسی لیے وہ اسلام دشمنی پالیسی کے سربراہ رہے۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے خلفائے راشدین کے دور تک یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمن پالیسیاں اظہر من الشمس رہی ہیں، تاریخ اسلام کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے، ان تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی جائے گی، یہ مقالہ یہود و نصاریٰ کے علمی و فکری، ذہنی و نفسیاتی رجحانات کی ایکسرے رپورٹ ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک علیٰ حالہٖ قائم ہے، نیز ان علمی روایات کی سراغ رسانی مقصود ہے جو یہود و نصاریٰ بالفاظ دیگر مستشرقین کی اسکالرشپ، ریسرچ، تالیفات و تصنیفات کا طرۂ امتیاز ہے۔

جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق (۷۰۰ یا ۶۴۹ء) سے جا ملتا ہے، جس نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا اور تحریری مناظرات کا منفیانہ دور شروع کیا اور بزنطینی تاریخی روایات کو مصدر اول تسلیم کر لیا گیا، دمشقی جان نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی، اس نے اسلام کو وثنی (Pagah.) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا، چونکہ اسلام کی تمسیخ کیلئے آنحضرت صلعم کی سیرت، شخصیت و دعوت کی تمسیخ ضروری تھی، اس لیے اس نے آپ کی حیات طیبہ اور سوانح پر حملہ شروع کیا، آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپ کو دیومالائی قصوں کا ہیرو بنا دیا، داستان سازی کے اس صنعت خانہ میں

آنحضرتؐ کے بارے میں طرح طرح کے افسانے اور مضحکہ خیز وثنی خرافات گھڑے گئے، یہی کہانیاں لاطینی یا بیزنطینی تاریخ اور بعد میں چرچ کی اسلامی تاریخ کا حصہ بن گئیں اور مستشرقین کی اسکالرشپ کا مصدر اصلی بھی، جان اور اس کے پیروؤں نے آنحضرتؐ کو بے دین قرار دیا نیز نبی کاذب کا خطاب دے کر اسلام کو ایک فاسد دین قرار دے دیا، اس نے آنحضرتؐ پر الزام لگایا کہ آپؐ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کیا، اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی ہے۔

جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرتؐ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق و ریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا، اس نے زینب بنت جحشؓ اور زید بن حارثہؓ کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب عناوین ہیں، ساتھ ہی جان نے تعدد ازدواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب De Haere-sIBus کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جان کے پیروؤں نے انہی بنیادوں پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار کھڑا کر دیا، یہی منفیانہ لٹریچر مغربی اسکالرشپ کے لیے حوالجات کا کام دینے لگے، بلکہ مڈل ایجز (ازمنۂ وسطیٰ) سے لے کر مغربی نشاۃ ثانیہ اور نشاۃ ثانیہ سے لے کر انتہائے بیسویں صدی تک مستشرقین کے لیے مصادر کا کام دیتے رہے، اسلام دشمن ادب کے اسی انبار میں ایک نامی گرامی رسالہ قابل ذکر ہے، یہ رسالہ عبدالمسیح بن اسحاق الکندی کی طرف منسوب ہے، چونکہ اس کا اثر مستشرقین پر آج تک موجود ہے، اس لیے مغربی اسکالرز نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، انیسویں صدی میں ولیم اس کا عربی متن پروٹسٹنٹ مشنری اسکول کے استعمال کے لیے ۱۸۸۰ء میں

لندن سے شایع کیا گیا، ولیم میور نے اس کا تلخیصی ترجمہ زیر عنوان The Apology of AL-KINDI لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا، یہ رسالہ مڈل ایجز میں رہنما اصول کا کام دیتا رہا، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، رسالہ کے مرکزی مضامین میں آنحضرت صلعم کی نبوت کا انکار، قرآن کا مذاق (اسے خبط خیالات کا غیر مربوط مجموعہ قرار دیا) سیرت محمدیہ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے، یہ رسالہ یورپ میں مڈل ایجز کی اسکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا، آج بھی رسالہ کا آسیب مستشرقین کے سر پر سوار ہے، یہی رسالہ بزنطینی مولفین کا مصدر بھی رہا، بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کی اسکالرشپ اپنی بھاری بھرکم تنقیدی اصطلاحات، موضوعی اور سائنسی جرح وتعدیل کے زبان دراز دعووں کے باوجود اس رسالہ کی گرفت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔

آٹھویں صدیؑ کے اواخر اور نویں صدیؑ کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفینس (۷۵۰ء تا ۸۱۸ء) نے کرانکل لکھی، اس تاریخ —— The Chronicles of Theosophane, the confessor کو اناسٹیس Anastasius نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنالیا اور یہ دونوں کتب مستشرقین کے مصادر (Sources of reference) بن گئے، کرانکل درحقیقت مڈل ایجز میں شایع شدہ خرافات کا مجموعہ ہے، اس کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے، مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ محمدؐ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ان کو اُمّی کہنا کذب ہے، اس کا بدیہی مقصد یہ تھا کہ اگر محمدؐ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کردیا جائے تو منطقی طور پر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے یہودی اور عیسائی الہامی کتب اور مصادر کا بغور مطالعہ کیا اور ان ہی معلومات کی مسخ شدہ صورت کا نام اسلام ہے، یہ کہانی اسلیے وضع کی گئی کہ اسلام کی اصلیت (یہودی الاصل یا عیسائی الاصل) Origins of Islam

کو ثابت کیا جائے، آج مغربی امریکی جامعات (یونیورسٹیوں) کا محبوب ترین موضوع درس اصلیت اسلام ہے، جس میں ان ہی قدیم مضامین کی تجدید کی جاتی ہے، اسی کرانکل میں آنحضرتؐ کے جنونی دورے (Epileptic fits) کی داستان بھی گھڑی گئی، اس قسم کے بے شمار افسانے مذکور ہیں جن کے اعادہ کی گنجایش نہیں۔

نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل (۸۶۷ء تا ۸۸۶ء) کی فرمایش اور حکم پر ایک بزنطینی مؤلف نے آنحضرتؐ کے خلاف ایک کتاب Refutatio Mohammad لکھی، جس میں آپؐ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا، قرآن کو کذب اور خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے اساسی عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا شدید مذاق اڑایا، مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ اصل خدا کی پرستش سے دور ہیں، اسلام چونکہ عیسیٰؑ ابن مریمؑ کے عقیدہ کا حامی ہے اور عیسیٰ ابن اللہ کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے اس لیے مؤلف کی نظر میں یہ مذہب اور اس کے پیامبر وداعی سب کاذب ہیں، دسویں اور گیارہویں صدیاں ان ہی افسانوں کی بازگشت ہیں۔

مستشرقین کا جو گروہ اسپین کی سرزمین سے اٹھا، وہ ان ہی مصادر کا پروردہ تھا، اسلامی علوم وفنون تہذیب وثقافت کا سکہ تقریباً نو سو سالوں تک اندلس میں قائم رہا، مگر مستشرقین اسپین نے کبھی اس بات کی سعی نہیں کی کہ بزنطینی مصادر کے بجائے براہ راست اسپین کی اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں، انھوں نے کرانکل کے افسانوں پر اپنی اسکالرشپ کی بنیاد ڈالی، دو مثالیں کافی ہیں، قرطبہ کا پوپ (St Eulogius) جو عرصہ دراز تک مسلم کلچر کا مطالعہ کرتا رہا، اور مسلم علماء وفضلاء کے ساتھ رہا، اپنی تالیف Liber Apologeticus Marlirum کی بنیاد کرانکل اور لاطینی مسودات ومخطوطات پر

رکھی، جس کا اعتراف خود بھی کیا ہے، اس نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف شدت نفرت کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ حیوانی زبان تک استعمال کی ہے، یہ کتاب بھی دیومالائی قصوں سے سجائی گئی، کچھ افسانے تو خود ساختہ ہیں اور کچھ کرانکل وغیرہ کے رہین منت ہیں، اسی طرح سان پرڈو پاسکل (San Perdo Pascal) نامی دوسرے اندلسی اسکالر کی تالیف Sobre ELSETONMahometana کنڈی کے رسالہ کا چربہ ہے، ان دونوں مؤلفین کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت کا آدہ سلگ رہا تھا، ان کے خیال میں اسپین پر اسلامی حکومت عیسائیوں کے لیے عذاب الٰہی تھی، اسلام ان کی نظر میں عیسائیت کا بدترین جانی دشمن تھا، اس سلگتی آگ کو چرچ کی تواریخ نے مزید شعلہ بداماں بنا دیا، چونکہ یہی کتب، تالیفات و مصادر، عام قاری، علماء اور اسکالرز کے مراجع تھے، اس لیے نفرت و حسد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی، ونسنٹ ڈی بویس (Vincent de Beauvais) متوفی ۱۲۶۴ء نے ان تمام داستانوں کو اپنی تالیف Speccu lam Historicale میں جمع کر دیا، اور آنحضرتؐ کو وثنی Pagan اور ذلیل (Low born) ثابت کیا، ان کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کو برقرار رکھا۔

کارزار صلیب اور مستشرقین اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی، اس کا نقطۂ عروج کارزار صلیب تھا، مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لیے صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سالوں تک جاری رہیں، اور پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکری قوت مسلم شرق اوسط پر زندگی کے لیے موت اور آبادی کے لیے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی، ۱۰۹۹ء میں پہلی خون آشام جنگیں ہوئیں، دوسری صلیبی جنگ ۱۱۴۷ء میں لڑی گئی اور تیسری معروف صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین اور شہنشاہ انگلستان رچرڈ کے

درمیان ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۳ء تک جاری رہی، چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۲ء، ۱۲۰۴ء کے درمیان لڑی گئی اور ۱۲۱۶ء میں پانچویں صلیبی جنگ پیش آئی، چھٹی صلیبی جنگ کا واقعہ ۱۲۲۸ء میں پیش آیا، جب یہ تمام کاوشیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں کی تاراجی کے لیے اہل صلیب نے منگول قوت کے ساتھ عسکری اتحاد ۱۲۴۹ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان قائم کیا، اسی اتحاد کا نتیجہ تھا کہ زوال بغداد کا واقعہ ۱۲۵۸ء میں پیش آیا، آٹھویں صلیبی جنگ ۱۲۷۰ء میں پیش آئی، نویں صلیبی جنگ ۱۳۶۵ء اور آخری دسویں صلیبی جنگ ۱۴۶۴ء میں پیش آئی، ان صلیبی جنگوں اور خون آشامیوں کا تعلق مستشرقین سے بڑا گہرا ہے، کیونکہ پانچ صدیوں میں یورپ کے مفکرین، مؤلفین اور شعراء اسلام کے خلاف مسیحی جذبات کو گدگداتے، اسلام اور مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتے اور ان کے اندر شہادت کا جذبہ پیدا کر کے آمادۂ پیکار ہونے کی روح پھونکتے رہے، جنگ صلیبی پر اسٹیون رنسی مان (Steven Runciman) کی تین جلدیں قابل مطالعہ ہیں، ہلاکو کی زوجہ خاصہ (CHief wife) ایک عیسائی خاتون تھی جو ہلاکو کی افواج کو مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتی رہی، بلکہ حملۂ بغداد کے موقع پر وہ خود ہلاکو کے ساتھ معرکہ میں شریک تھی، ہلاکو کا سب سے زیادہ معتمد علیہ کمانڈر (Kutabuga) بھی نسطوری عیسائی تھا اور بغداد کی مہم میں شریک تھا، جب بغداد برباد ہوا تو اسّی ہزار افراد قتل کیے گئے (ملاحظہ ہو رنسی مان کی جلد دوم۔ صفحات ۲۴۶ تا ۳۰۰، نیز ملاحظہ ہو راقم الحروف کی فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات باب چہارم ص ۱۷۶ تا ص ۲۰۳)

صلیبی جنگوں کی پانچ سوسالہ تاریخ (از ۱۰۹۹ء تا ۱۴۶۴ء) کے دوران یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو لٹریچر پیدا کیا، اس کا سرسری جائزہ لن ترضیٰ ... کی تشریح کے لیے ضروری ہے۔

تمام صلیبی جنگوں میں یورپ کی مشترکہ عسکری قوت کا دیوالہ نکل گیا، اسی شکست فاش کی بنا پر اسلام

اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت کی نئی لہر دوڑ گئی، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت کے
ساتھ میدانِ مبارزہ میں اتر آیا، شعراء نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کردی، اس میں دانتے
کا نام بھی قابل ذکر ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کی تمسیخ
کی نئی تحریکیں چل پڑیں، ۱۱۴۱ء میں پیٹر (Peter the Venerable) نے چند عربی کتب کے
تراجم لاطینی زبان میں کرائے، رابرٹ (Robert) اور ہرمن (Herman) نامی مؤلفین نے
چار عربی کتب کے تراجم کیے، جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، رابرٹ
نے قرآن کا ترجمہ کیا اور پیٹر نے اس کی تردید کی، نیز یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز
ہیں، پیٹر کی تحریرات اور تالیفات نے یورپ میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باقاعدہ
محاذ آرائی کا دور شروع کیا، یہی تالیفات مستشرقین کے معصوم مصادر بنے رہے، اب اسلام کے
خلاف محاذ آرائی میں لاطینی زبان کے علاوہ یورپ کی دیگر زبانیں بھی صف آرا ہوگئیں، نثر کے ساتھ
نظم بھی صف آرا ہوئی، فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا، یہاں پر چند امہات الکتب
کا ذکر کافی ہوگا،

والٹر (Walter of Sens) نے لاطینی زبان میں اور الگزنڈر (Alexander Dupont)
نے فرانسیسی زبان میں آنحضرتؐ کے خلاف دل کھول کر لکھا، ایک شعری مرثیہ گیارہ سو بیالیس ۱۱۴۲ اشعار
پر مشتمل زیر عنوان (Avila Muhamiti) لکھا گیا، اور اسے بارہویں صدی کے شاعر امبری کو
(Embricoof Maine) کے نام سے منسوب کردیا گیا، اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف نفرت کا
امنڈتا ہوا ایک طوفان تھا، ہر قسم کے غلیظ الفاظ استعمال کیے گئے، بعضوں نے اسی مرثیہ کو ہلڈبرٹ
(Hildebert of Tours) نامی شاعر (متوفی ۱۱۳۳ء) کی طرف منسوب کردیا، یہ مرثیہ
گویا آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کا شعری مجموعہ تھا، اسی قسم کی شعری سیرت زیر عنوان اوٹیو دی محمد

(Otiode Machomet) ۱۰۹۰ اشعار پر مشتمل تھی، والٹر نے وسط بارہویں صدی میں لکھی جو پہلے
مرثیہ کا نقش ثانی تھا، حروب صلیبیہ پر تالیفات کا زور ہوا، معروف مؤلف گلبرٹ (Guilbert
of Nogent) نے پہلی صلیب پر ایک کتاب زیر عنوان گیستا (Giesta Dei Der
Franceos) لکھی، اور ۱۱۱۲ء سے قبل ہی مکمل کرلیا، اس تالیف میں آنحضرتؐ کی سیرت پر
ایک باب ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا چربہ ہے، آنحضرتؐ کے نام تک کو مسخ کرنے کی سعی
کی ہے، اور محمدؐ کے بجائے ماتھومس (Mathomus) لکھا ہے، اس میں راویوں کی زبانی داستانیں
نقل کی گئی ہیں، سب سے دلچسپ افسانہ جو مولف نے درج کیا ہے وہ لائق سماعت ہے،
مذہب اسلام کے وجود کے سلسلہ میں مؤلف رقمطراز ہے کہ الگزنڈریا (Alexandria)
کے پیٹریارک (Patriarch) کا الکشن ہونے والا تھا، اس انتخاب میں حصہ لینے والا امیدوار
پادری اپنے انتخاب سے مایوس ہوگیا تو اس نے چرچ کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ تیار کیا، اس
مقصد کی خاطر اس نے محمدؐ کے ساتھ ساز باز کیا اور عیسائیت میں پھوٹ ڈالنے کے لیے محمدؐ کو
زبردست تربیت دی اور آپ کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہؓ سے کروا ڈالی، پادری مذکور
نے محمدؐ کی حمایت کی اور ان کی نبوت کا اعلان کیا تاکہ مسیحیت پر ضرب کاری پڑ سکے، چنانچہ محمدؐ اس طرح
نبی بن گئے اور مذہب اسلام کی دعوت دینی شروع کردی، اس طرح مذہب مسیحیت میں تفرقہ پڑ گیا،
جو ہنوز باقی ہے.

اس سے زیادہ دلچسپ داستان گھڑی گئی کہ محمدؐ خود پادری (CARDINAL) تھے، اور
پوپ (POPE) کے مرتبہ پر ترقی پانے کے امیدوار بھی، مگر جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ
روم سے بھاگ کر عربیہ گئے اور وہاں نبوت کا دعویٰ کردیا، ایک روایت کے مطابق یروشلم کے
بشپ سرگیس (SERGIUS) نے محمدؐ کو نبوت کے دعویٰ پر اکسایا اور ان کے لیے قرآن نامی کتاب لکھی

بارہویں صدی عیسوی کی خرافات نویسی میں دو ایسے مؤلفین ضرور نظر آتے ہیں جنھوں نے مستشرقین کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنی چاہی، مگر ان کی حیثیت آٹے میں نمک کی تھی، ولیم نامی مؤلف (William of Malmesbury) نے اسلام اور وثنیت (Paganism) میں فرق پیدا کیا اور لکھا کہ اسلام چونکہ توحید کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے وثنی نہیں ہو سکتا، ۱۱۲۰ء میں اس نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان محمدؐ کو نہ تو خدا مانتے ہیں، نہ ہی ان کی پوجا کرتے ہیں، اس کے برخلاف وہ محمدؐ کو محض خدا کا نبی تسلیم کرتے ہیں، دوسرا مؤلف الفونسو (Alfonso) تھا جو اصلاً یہودی تھا، مگر ۱۱۰۶ء میں مصلحتاً عیسائیت قبول کر چکا تھا، عیسائیت اور یہودیت کی باہمی رقابت و تصادم محتاج تعارف نہیں، دو ہزار سالہ رقابت کے باوجود آج وہ قرآن کی تصدیق کے مطابق بعضہم اولیاء بعض ہیں، آج یہ حقیقت جس طرح عیاں ہے شاید تاریخ کے کسی زمانہ میں اس طرح آشکارا نہ تھی، الفونسو نے یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک انہامی ڈائیلاگ لکھا جس میں اسلام کے متعلق بہتر خیالات کا اظہار کیا، شاید مسیحی دنیا کو جو یہودیوں کی جانی دشمن تھی غیرت دلانا مقصود ہو، تیرہویں صدی عیسوی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی، ۱۲۷۱ء میں ولیم William of (Tripoli) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی، تاکہ مشنری اپنی تبلیغ کے لیے استعمال کر سکیں، اس سوانح میں مؤلف خرافات کے علاوہ کچھ پیش نہ کر سکا، اس نے قرآن کریم کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ گھڑا، اس کے خیال میں قرآن مجید کی ترتیب و تالیف آنحضرتؐ کے وصال کے پندرہ سال بعد ہوئی، اس کی تدوین کا کام ایک کمیشن کے حوالہ کیا گیا تھا، چونکہ آنحضرتؐ کی تعلیمات میں کوئی نئی اور مفید بات اراکین کمیشن کو نظر نہیں آئی، لہٰذا انھوں نے خود ہی قرآن نامی کتاب کی تدوین کر ڈالی، یہ کام خرافات لاطینی روایات کے اجزاء ترکیبی بنتے چلے گئے، مستشرقین نے آنحضرتؐ کی کامیابی کے دو اہم رازوں کا انکشاف کیا، ایک تو جادو تھا اور دوسرا عیاری تھا، مؤلفین نے اصرار کیا کہ

اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، نبوت کے انکار کے لیے یہ دلیل پیش کی گئی کہ آنحضرتؐ نے خود اپنے آپ کو ایک عام آدمی قرار دیا ہے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا، لہٰذا وہ نبی ہو نہیں سکتے۔

ازمنۂ وسطیٰ سے نشاۃ ثانیہ تک مستشرقین کا سفر

دانتے اٹلی کا معروف شاعر ازمنۂ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، (دانتے ۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) نہ صرف اٹلی کی نشاۃ کا جد امجد ہے، بلکہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے، اس کی معروف و شہرۂ آفاق نظم (The Divine Comedy) کو نشاۃ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم کی تدوین و تاسیس میں دانتے نے آنحضرتؐ کی احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے، میڈرڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاذ پلاسیوس (Placious) نے ۲۵ سالہ ریسرچ اور جانکاہ اور دیدہ ریز محنت کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ دانتے نے اس نظم کی تدوین میں نہ صرف معراج کی احادیث سے استفادہ کیا ہے، بلکہ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور المعری کی رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا، دانتے نے علوم اسلامیہ اپنے اطالوی استاد برونیلو لاطینی (Brunello Latini) سے جو عربی زبان کا ماہر تھا، حاصل کیے، نظم کی ترتیب میں فتوحات مکیہ کی نقل کی، یورپ میں احادیث معراج پر خاصا مواد موجود تھا، پیرس کی لائبریری میں احادیث معراج پر مخطوطات بھی موجود تھے، پروفیسر منارڈ نے اپنی کتاب زیر عنوان "بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں مطالعہ اسلام" میں ان فرانسیسی مسودات کے نام گنائے ہیں، جہاں تک دانتے کی رسائی ممکن تھی، غزالی کی الدرۃ الفاخرۃ اور معراج نامہ تک دانتے کی رسائی تھی، کتاب المعراج کے لاطینی اور فرانسیسی تراجم اس وقت موجود تھے اور دانتے کی پیدائش (۱۲۶۵ء) سے پچاس سال قبل ۱۲۰۶ء میں شایع ہو چکے تھے، (Professor Cerulli) کا اصرار ہے کہ نظم کی تدوین میں دانتے نے ان ہی مصادر سے استفادہ کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس مستشرق

شاعر نے جو علوم اسلامیہ میں دخل رکھتا تھا، اسلام اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی، وہ تفریق مذہب کے مجرم ہیں، شاعر کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شلہ کردہ زیر عذاب دکھاتا ہے، یہ اصحاب قدسیہ مسخ شدہ صورتوں میں زیر عذاب ہیں، اور ان کا جرم کبیر یہ تھا کہ انھوں نے مذہب میں افتراق پیدا کیا، انفرنو (Inferno) کے کینٹو ۲۸ Canto 28 میں دانتے رقمطراز ہے: (نقل کفر کفر نباشد)

Behold, how mutilated is Mahomet

In front of me the weeping Ali goes

His face cleft through from forelock to the chin

AND all others that you see about

Fomenters were of discord and of schism

And that is why they are so gnashed as under

(دی ڈیوائن کمیڈی، ترجمہ ال۔ گرانٹ وہائٹ۔ نیویارک ۱۹۴۸ء۔ کینٹو ۲۸)

دانتے پر صلیبی جنگوں کی ناکامی و شکست کا ایسا اثر تھا کہ اس نے سارے یورپ کو اپنی شعری قوت سے ہلادیا، ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف فاتح قدس صلاح الدین ایوبی کو بھی اس نے جہنم میں منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھایا۔ (ملاحظہ ہو کینٹو ۴ Inferno) اسلام دشمنی کے اس مظاہرہ کے بعد دانتے نے صلیبی شہسواروں اور شہداء کو جنت میں فرحاں و شاداں دکھایا، کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے لیے شہید ہوئے تھے، جنت (Paradiso) کینٹو ۱۸ میں دانتے ان کی شادمانی کا ذکر کرتے ہوئے

نام بہ نام خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

And then my eyes saw passing on the cross

William of Orange and Stout Renoat

Duke Godfrey, de Boollon and Robert Guiserard[1]

ان اشعار اور نظموں نے مغربی جذبات میں آگ لگا ڈالی اور نشأۃ ثانیہ کے دور میں جب رواداری، اخوت اور روشن خیالی کی تحریکات سر اٹھا رہی تھیں، دیگر مذاہب کے ساتھ انصاف کا مطالبہ ہو رہا تھا، مستشرقین کا رویہ اسلام کی جانب علیٰ حالہٖ قائم رہا، سنہ ۱۳۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک کا زمانہ نشأۃ ثانیہ کا ابتدائی زمانہ تھا، نشأۃ کے بعد دوسری طاقتور تحریک جو یورپ میں اٹھی وہ رومانی تحریک (سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۸۳۲ء) تھی، جس نے یورپ کی روایات کہنہ کو چیلنج کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، نئے خیالات پر مبنی انقلاب انگیز تحریکیں چلتی رہیں، رومی اور یونانی تہذیب سے آزادی حاصل کرکے خود مغربی تہذیب کی داغ بیل ڈالنے کی زبردست تحریک چلی، مذہبی تقشف و تعصب کے خلاف نئے مکاتب فکر وجود میں آئے، مگر اسلام کے

---

[1] دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید معلومات کے لیے، راقم حروف کی دو[2] کتابیں پیش نظر رہیں:

(الف) فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات (جامعہ کراچی ۱۹۷۶ء) صفحات ۵۶۱ تا ۵۹۱، اس حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ معراج اور ڈیوائن کمیڈی جزولاینفک ہیں، یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر معراج کے کیا اثرات مترتب ہوئے؟ دانتے نے ابن عربی سے کیا کچھ لیا ہے؟ اس کا نصی تقابل، کامیڈی میں جنت و جہنم وغیرہ کے نقشے ابن عربی سے مستعار لیے گئے، ان کا نقشہ جاتی تقابل، وغیرہ وغیرہ۔

(ب) فکر و فن (جامعہ ڈیرین) ۱۹۸۱ء۔ (اردو عربی اور فارسی مقالات کا مجموعہ) ملاحظہ ہوں صفحات از ۲۵ تا ۳۴ زیر عنوان دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات ص ۹۵ تا ۱۱۲ بھی ملاحظہ ہوں زیر عنوان جرمن شاعر گوئٹے کا منظوم دیوان "ناتھن دانا"۔

متعلق مستشرقین کے رویہ میں بال برابر فرق نہیں آیا، نشاۃ ثانیہ کا پورا دور مڈل ایجز یعنی ازمنۂ وسطی کے خرافات کے زیر اثر رہا، وہی افسانوی اور دیو مالائی تعبیر و تفسیر اسلام کا مقدر تھا، چونکہ نشاۃ ثانیہ کے مصادر لاطینی مصادر (Latin Chronicles) تھے اس لیے ان سے رستگاری ممکن نہ تھی، ہر روایت پر صلیبی اور بزنطینی چھاپ پڑی ہوئی تھی، یہی مصادر آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے، سوانح محمد میں یہی لکھا گیا کہ آپ الحاد اور بے دینی کے ملزم تھے، آپ نے عیسائیت میں تفرقہ پیدا کی، آپ کو کاذب قرار دے کر اسلام کو عیسائیت کا ازلی دشمن تصور کیا گیا، خود مسیحی طبقات میں کشمکش شروع ہو گئی، رومن کیتھولک چرچ نے پروٹسٹنٹ چرچ پر اسلام دوستی کا الزام لگایا، اور انھیں اسلام کا ہمدرد قرار دیا، دونوں فرقوں کے درمیان یہ مسئلہ موضوع نزاع بن گیا، اس پورے عہد میں آنحضرت اور اسلام کے لیے نجس الفاظ استعمال کیے گئے، جو مڈل ایجز کا امتیازی نشان تھا آنحضرت کے لیے رذیل الفاظ مثلاً کاذب (Cunning Imposter, Lying deceiver, Blasphemous emissary of Satan) وغیرہ عام تھے، بعض مستشرقین نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ کو تضیع اوقات قرار دیا، بعض نے لکھا کہ محمد کا نام سنتے ہی خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

سترہویں صدی کے بعد مغربی استعمار کا ظہور اور مصلحت بینی کی تحریک، مستشرقین کے مصادر میں نئے اضافے

سترہویں صدی عیسوی نے مستشرقین کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیے، یہ صدی عروج استعمار کی صدی تھی، عالم اسلام عموماً انگریز، فرنچ، ڈچ وغیرہ کے پنجۂ استبداد میں آ چکا تھا، اس طرح مغربی اقوام براہ راست عالم اسلام سے ٹکرائیں، اسلامی کلچر اور علوم اسلامیہ سے ان کا سابقہ ہوا، مستشرقین سیاح ان ممالک کا دورہ کرنے لگے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تمام لاطینی اور بزنطینی روایات کی ضد تھی، اس تضاد نے مستشرقین کے سامنے سوالیہ نشانات کھڑے کر دیے۔

اس اثنا میں استعماری قوتوں نے مثلاً برطانیہ، فرانس اور ڈچ وغیرہ نے سیاسی، معاشی لوٹ مار کے ساتھ اسلامی علوم و فنون، مسودات و مخطوطات کے نادر نسخوں کی بھی لوٹ مار کی، اور تمام عالم اسلام سے اسلامی گنجہائے گراں مایہ اور صدیوں کی علمی و فکری کاوشات کے خزینے اٹھا کر لندن اور پیرس اور ہالینڈ لے گئے اور اپنے کتب خانوں اور میوزیم کی زینت بنا ڈالی، آج بھی ان نوادرات کی نمائش یورپ میں ہو رہی ہے، جہاں ناظرین صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد، پیرس میں ۱۹۷۳ء کی بین الاقوامی مخطوطات کی نمائش دیکھ کر راقم سطور انگشت بدنداں تھا۔

مستشرقین اب نئے مصادر اسلامی سے دوچار ہوئے، عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی تحریک چلی، کیونکہ اس کے بغیر ان مصادر تک رسائی ممکن نہ تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس اور لندن میں عربی کے شعبے کھلے، ۱۶۴۹ء میں قرآن کریم کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شایع ہوا، سترہویں صدی کی سب سے طاقتور تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی، جس میں غیر عیسائی مذاہب و عقائد کے منصفانہ مطالعہ پر زور دیا گیا، ان تحریکات کے دباؤ میں بعض مستشرقین نے بھی اسلام پر نظر ثانی یا از سر نو تجربہ کی دعوت دی اور اسلام کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی، اب مستشرقین کے سامنے تین اہم مصادر تھے، (۱) ازمنۂ وسطی (مڈل ایجز) کا روایتی مواد (تاریخ و سوانح وغیرہ) نیز لاطینی مصادر (کرانکل وغیرہ) (۲) اسلامی اور عربی مصادر جو استعمار کے ذریعہ دستیاب ہوئے۔ اور (۳) مغربی سیاحوں کے سفرنامے جو انھوں نے مسلم ممالک کے دورے اور سیاحت کے بعد مرتب کیے۔

مستشرقین کی تاریخ کا ادنی طالب علم بھی یہ دیکھ کر حیرت زدہ اور ششدر رہ جاتا ہے کہ ان تمام تحریکات اور نئے مصادر کا کوئی اثر مستشرقین کے رویہ پر نہیں پڑا، نہ ہی ازمنۂ وسطی کی

روایات سے گلو خلاصی ہو سکی، وہ اب بھی لاطینی روایات کے اسیر رہے، یورپ میں اب
مزید انتشار پھیلا، کیونکہ سیاحوں کے سفرنامے لاطینی اسکالرشپ کے خرافاتی نقشے سے بالکل مختلف
تھے، آنحضرتؐ کے بارے میں ایک دوسرا اور مضحکہ خیز افسانہ گھڑا گیا، یعنی محمدؐ ہرقل کی فوج
میں باغی تاجروں کے قائد تھے، اور عربوں کے باغی گروہ کے کیپٹن بھی تھے، مگر ایران پر حملے
کے وقت محمدؐ نے ہرقل کی فوج کا ساتھ دیا، انگریز فلسفی راجر بیکن (R.Bacon) نے
آنحضرتؐ کو من حیث جادوگر پیش کیا، اور اپنے مقالات بالخصوص Of Boldness میں
آنحضرتؐ کے بارے میں خرافات وضع کیں۔

زمانہ سفر کرتا گیا، وقت آگے بڑھتا رہا، مگر مستشرقین رجعت قہقری کرتے رہے، یورپ
میں جدید دور کا آغاز ہوا، "جاگو ہوا سویرا" کی اذان دی گئی، مارٹن لیوتھر کی قیادت میں چرچ
اور خرافاتی رسم و رواج کے خلاف ایک قیامت برپا ہوئی، خیال تھا کہ جدید یورپ میں اصلاحات
کا مفکر اعظم مارٹن لیوتھر اسلام کے بارے میں شاید نرم رویہ اختیار کرے، اس کے بالکل برعکس
اس نے اسلام اور مسلمانوں کو حق کا دشمن گردانتے ہوئے اسلام کو ترکوں کا مذہب قرار دیدیا،
چونکہ مارٹن کا سارا حملہ چرچ اور پوپ کے خلاف تھا، اس لیے اس نے آنحضرتؐ کو پوپ سے
بھی زیادہ بدتر قرار دیا، اس نے مطالبہ کیا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس امر کی تحقیق کی
جائے کہ آیا اسلام اور محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کے آخری دشمن تھے، تاکہ یہ مسئلہ حتمی طور پر طے ہو جائے
کہ اسلام اور محمدؐ ہی مارٹن کے خیال میں مذہب عیسائیت کی بربادی کے ذمہ دار تھے، لیوتھر
نے آنحضرتؐ کو گاگ اور میگاگ (Gog, Magog) کا خطاب دیا۔

چونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ کا پروردہ تھا، (یہ روایت ہنوز جاری ہے) اس لیے
مذہبی نفرت ان کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز تھا، اس کو اسکالرشپ کہنا اسکالرشپ کی توہین ہے،

یہ سارا ریسرچ مواد درحقیقت مشنری پروپیگنڈا تھا، چند مثالیں کافی ہیں، سترہویں صدی کے
نامی مولف بڈول (Bedwell) متوفی ۱۶۳۲ء نے اپنی تالیف "محمد کاذب" ——
(Mahammedl s Impostures) میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت گستاخی کی،
جیساکہ کتاب کے نام سے واضح ہے (Genebard) نامی کیتھولک مولف کا سب سے
بڑا الزام یہ تھا کہ محمدؐ نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان مثلاً لاطینی، عبرانی، اور یونانی میں
نہیں کی، بلکہ ایک وحشی زبان میں کی، چونکہ محمد خود (العیاذ باللہ) جانور Beast تھے
اس لیے قرآن کو بھی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا۔

اینڈری (Andre du Ryer) نے چند عربی کتب کے انگریزی ترجمے کیے، ساتھ
ہی ۱۶۴۹ء میں قرآن کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ بھی پیش کیا۔

جدید تحریکات کے زیر اثر سترہویں صدی میں اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا،
مگر لاطینی، خرافاتی روایات سے گلو خلاصی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بعض روشن خیال اسکالرس نے
وقتاً فوقتاً روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی، ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک
(Edward Peacoke) متوفی ۱۶۹۱ء تھا، موصوف نے چند عربی کتب کے ترجمے
کیے، نیز حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس نے
سیرت محمدؐ پر نظر ثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا، اٹلی کا پادری مستشرق (Abb)
LouisMaracci نے قرآن کا لاطینی ترجمہ کیا اور اپنی تالیف پروڈرمس (Prodomu s ad
Refutationem) میں اسلام پر زبردست حملے کیے، آنحضرتؐ کو واضح الفاظ میں
نبیؐ کاذب قرار دیا، سترہویں صدی میں انگلینڈ الیکزنڈر راس (Alexander Ross)
نے اپنی تالیف پنڈبلیا (Pandeblia) ۱۶۵۳ء میں جو تقابل ادیان پر

لکھی گئی تھی، لاطینی خرافات سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اسلام کے بارے میں پہلی بار
چند اچھے کلمات استعمال کیے، انگریزی چیلین یا پادری (Chaplain) مسمی ایڈیسن
(Lancelot Addison) نے حیات و موت محمد (Life and death of
Muhammad) کے زیر عنوان اپنی کتاب ۱۶۷۸ء میں لندن سے شایع کی، مگر
اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف مولف کا سب سے بڑا
اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی کتاب قرآن کو شایع نہیں کیا، ۱۶۹۷ء میں
نارویچ کا ڈین (Dean of Norwich) مسمی ہمفری (Humphery Prideaux)
نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی اور آپ کو نبی کاذب (Imposter) قرار دیا، مؤلف
نے اعتراف کیا کہ وہ ازمنۂ وسطی کے مولف رکاڈو (Ricado) سے بے حد متاثر ہوا تھا،
ہمفری کی کتاب تقریباً ایک صدی تک مستشرقین کے لیے حوالہ کا کام دیتی رہی، کتاب کا
مرکزی مضمون اسلام کو فراڈ ثابت کرنا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سیاسی مفادات کے زیر اثر نام نہاد اسلامی لٹریچر کی افزائش

سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں اٹھارہویں صدی میں اسلام پر
زیادہ لٹریچر تیار ہوا، اس میں سیاسی مفادات کا دخل زیادہ
تھا، مگر مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی بھی لاطینی روایات
اور ازمنۂ وسطی کے عقائد کی زد میں رہی، سب سے پہلا ڈچ مستشرق ایچ۔ ریلان۔
(H.Relan) نے آنحضرتؐ کی جانب رویہ میں تبدیلی پیدا کی، اپنی معروف
تالیف مذہب محمدؐ" (De religione Mahommedica) ۱۷۰۴ء
میں اس نے ازمنۂ وسطی کے خرافات سے رہائی کی کوشش کی، اور اسلام اور محمدؐ کے ساتھ
انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، غالباً یہ پہلا مستشرق تھا جس نے رواداری (Tolerance) کا

مطالبہ کیا، اس نے پہلی بار یہ تحریک چلائی کہ مشرق کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کے
بغیر سمجھا نہیں جا سکتا، یہ مطالبہ یقینی طور پر پہلا مطالبہ تھا کہ اہل مغرب کے بجائے خود مسلمانوں
کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب و کلچر کی تفسیر و تشریح پیش کریں اور اہل مغرب کے افہام و تفہیم کا
ذریعہ بنیں، مذہب کو اس کے مخالفین ہمیشہ مسخ کرتے ہیں، مولف نے واضح الفاظ میں
تحریر کیا کہ یورپ میں اسلام کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس قدر تمسیخ کا شکار ہوا
ہو، مؤلف نے اس امر پر بھی اصرار کیا کہ اصل اسلام کو کما حقہ سمجھنے میں خود عیسائیت کا
فائدہ ہے، اور یہ افہام و تفہیم دوستی کے ذریعہ ممکن ہے، دشمنی کے ذریعہ نہیں، عیسائیوں
کا غرور اسی طرح کم ہو سکتا ہے اور ان کے اندر شکر ایزدی کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے
کہ اس نے عیسائیت جیسے مذہب کی نعمت سے ہمیں سرفراز کیا، ریلان درحقیقت
پہلا مستشرق تھا جس نے اسلام کے ساتھ تاریخی انصاف کا مطالبہ کیا۔

اس تحریک کا اثر دیرپا نہ تھا، بعض مولفین ان خیالات سے متاثر ضرور ہوئے،
مثلاً کانٹ (Count de Boulainvilliers) نے اپنی کتاب
(Vie de Mahomet) (لندن ۱۷۳۰ء) میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا، لیکن اس کے خلاف حملے شروع ہو گئے، اور اس پر مسیحیت
کی تخفیف کا الزام بھی لگایا گیا، ناقدین کے مطابق یہ کتاب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی
جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی، جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی، مولف نے اسلام کو
پہلی بار ایک عقلی مذہب (Rational Religion) قرار دیا اور آنحضرتؐ کو نبی
تسلیم کر لیا، یہ اقدام تمام سابقہ مسیحی اور یہودی مستشرقین کے عقائد و مزاج کے خلاف تھا
اس میں نہ صرف مڈل ایجز اور لاطینی خرافات کی نفی تھی، بلکہ نشاۃ ثانیہ جیسے روشن خیال

دور کی اسلام دشمنی کے خلاف بھی پہلی صدائے بازگشت تھی، یہ رویہ مستشرقین کے لیے ناقابل قبول تھا، اس کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت پڑی تاکہ یہ خیالات یورپ میں جڑ نہ پکڑ سکیں، چنانچہ یہی ہوا، جارج سیل (George Sale) اور راڈول (J.M.Rodwell) کے معاندانہ جذبہ میں شدت پیدا ہوئی، سیل نے بڑی چستی کے ساتھ آنحضرت ؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False Religion) قرار دے دیا، جین گگنیر (Jean Gagnier) نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کتاب ۱۷۳۳ء میں اور دوسری ۱۷۴۸ء میں منظر عام پر آئی، ان دونوں کتب کا مقصد بولین ولیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ولیر کی تالیف کے مقابلہ میں ایک نئی تالیف محمد (Vie de Mahomet) پیش کی جو اسٹرڈم سے ۱۷۴۸ء میں نمودار ہوئی، کتاب کے مقدمہ میں بدبخت مولف نے آنحضرت ؐ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن، بلکہ خدا کا بھی دشمن قرار دیا، چونکہ روشن خیالی، انصاف اور جدت پسندی کا دباؤ یورپ پر بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے بعض مولفین نے ان سے متاثر ہو کر چند کلمات خیر عرض کہنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اس ضمن میں سیوری (Savery) نامی مولف کا ذکر کافی ہے، موصوف نے ۱۷۵۲ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا، اور اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرت ؐ کے لیے نرم الفاظ استعمال کیے، اور آپ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا، مگر وہ ازمنۂ وسطیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکا، اسی لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور قدیم نظریہ کی تائید کی کہ محمد ؐ نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدۂ توحید کو مستعار لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی۔

ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کا نام محتاج تعارف نہیں، زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر موصوف نے آفاقی شہرت حاصل کی اور انگریزی تاریخ نویسی کے معمار بن گئے، ۱۷۸۸ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور محمد ؐ کے بارے میں نہایت دلسوز رائے کا اظہار کیا، رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرت ؐ کو نبی کاذب (Imposter) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرت ؐ آخری ایام میں شہوت اور لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی (lust and ambition) سے مغلوب ہو گئے، محمد ؐ ظلم، فراڈ اور ناانصافی کا مجسمہ تھے، اسلام ان ہی ذرایع سے پھیلا، یہ تھی اس روشن خیال مولف اور مورخ کی رائے جس نے روما الکبریٰ کی تاریخ نویسی پر ربع صدی صرف کی، اور نہ صرف روما بلکہ اس سے متعلق تمام معلوم اقوام کے احوال لکھے جن کا تعلق رومی حکومت سے رہا تھا، اس میں اسلام اور مسلمان سب سے نمایاں تھے، کیونکہ اہل روما سے ان کا ٹکراؤ ہوا تھا،

اٹھارہویں صدی کی دوسری عظیم شخصیت جو انقلاب فرانس کے بانیوں میں سے ایک ہے، وہ والٹیر (Voltaire) کی شخصیت ہے (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء) والٹیر فرانسیسی آسمان فکر کا تابندہ ستارہ اور مصلحین کا پیامبر تھا، اٹھارہویں صدی پر اس کے افکار کی کارفرمائی بلکہ سلطانی قائم رہی، مگر والٹیر جیسا مفکر اسلام اور محمد ؐ کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہ سکا، اس نے اپنے ڈرامہ (Play) دین محمد مسمّی —— (Le Fanalisme ou Mahomet Laprophets) میں جو ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آئی، اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا، اس نے یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمد ؐ کی جانب

نرمی کا رویہ اختیار کیا، یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت صلعم کو نبی کاذب (Imposter) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب (False barbarous religion) سے موسوم کیا، اس نے اپنے ڈرامہ کو پوپ (Pope Benedict XIV) کے نام منسوب کر دیا، اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اُگلا، مسلمانوں کو درندہ، جنگلی اور وحشی قوم (Barbarous Sect) کا خطاب عطا کیا، اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرت صلعم اور اسلام کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا، مجموعۂ مقالات (Essai Sur les Moeurs et L' des Nation) میں اس نے آنحضرت صلعم کو برطانوی سیاستدان کرام ول (Cromwell) کی عیاری سے تشبیہ دی ہے، والٹیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کی پوری دعوت میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی، اس کے سوا کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر مستشرقین پر پڑا، ان میں ایک ڈیڈراٹ (Diderot) ہے، جس نے آنحضرت صلعم کی گھناؤنی سیرت پیش کی اور آپ کو عقلیت (Reason) کا دشمن اور عورتوں کا دلدادہ ثابت کیا، فرانسیسی مستشرق رنان (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۹۲ء) (Rennan) نے بھی اسلام کو عقل کا لاعلاج دشمن Incurable Enemy of reason قرار دیا۔

اٹھارہویں صدی کی مختصر روح فرسا روداد کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب قاری انیسویں صدی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ خلف اپنے سلف سے اور متبعین اپنے پیش روؤں سے زیادہ متقشف، متعصب اور زہر آلود ثابت ہوئے، ان پر نہ تحریک تجدید کا کوئی اثر پڑا، نہ ہی یورپ کی روشن خیالی، رواداری اور انصاف کی تحریکات نے ان کے دل کو موم بنایا، شدتِ نفرت میں وہ اپنے بزرگوں اور متقدمین سے بھی بازی لے گئے۔

(باقی)

حکمرانوں کے ثقافتی پہلو اور شاہانِ عباسی کی عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی کے اثرات

از۔ ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی، سینیر لائبریرین بیرو یونیورسٹی، کانو، نائجیریا

(۲)

۲۵۔ کتب خانوں کے لیے علیحدہ عمارتیں بنوائی جاتی تھیں، چنانچہ سابور بن اردشیر المتوفی ۴۱۶ھ نے ۳۸۱ھ میں محلہ کرخ بغداد میں علیحدہ عمارت تعمیر کرا کر کتب خانہ قائم کیا تھا[1] اصفہان میں ابوالشیخ بن محمد نطنزی المعروف بذی البراعتین المتوفی ۵۳۹ھ نے دار الکتب کی نہایت عالیشان عمارت تعمیر کرائی شروع کی تھی، جو پوری بن جاتی تو اصفہان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ خوشنما و پائیدار ہوتی، مگر ذی البراعتین کی سیاحت اور اس کے باہر رہنے کی وجہ ہمیشہ بنتی اور ٹوٹتی رہی تھی ۔۔ اس واقعہ کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ ابوفراس عامری المتوفی ۵۶۳ھ نے اس پر حسب ذیل شعر کہے تھے۔

دار کتب بغیر کتب و مال	من تراب انفقته فی تراب
یہ دار الکتب بغیر کتابوں کے ہے	مال جو زمین سے حاصل کیا تم نے زمین میں لگایا
انت فی (عامر) بزعمك	منہا واللّٰہ کل ساعۃ فی خراب
تم اپنے زعم میں اسے آباد کر رہے ہو	بخدا وہ تو ہر آن برباد و خراب ہوتا رہتا ہے

[1] المنتظم، ج ۸، ص ۱۶۲؛ البدایہ والنہایہ، ج ۱۱ ص ۳۱۲؛ الکامل فی التاریخ، ج ۹ ص ۱۰۱ [2] خریدۃ القصر وجریدۃ العصر لعماد الاصفہانی تحقیق محمد بہجۃ الاثری، بغداد، مطبعۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۷۵ھ ج ۱ قسم ۳

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کو کتب خانوں کی عمارت تعمیر کرنے کا شوق بھی اسی تحریک سے پیدا ہوا تھا۔

۲۶ - کتب خانہ کے ساتھ رصدگاہ کا سامان بھی رکھا جاتا تھا، چنانچہ ابو طاہر خاتونی ساوی المتوفی ۵۲۰ھ نے جامع خاتونی میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں تجربات کے لیے رصدگاہ کا سامان بھی محفوظ کر دیا گیا تھا۔[1]

۲۷ - اہل علم نہایت عسرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود قابل رشک کتب خانہ بناتے تھے، چنانچہ ابراہیم حربی المتوفی ۲۸۵ھ فقر و فاقہ سے بسر کرتے لیکن ذخیرۂ کتب بڑھاتے رہتے تھے، دولت مند ان کی تنگ دستی اور ان کے کتب خانے کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر کسی سے نہ رہا گیا، اور اس نے موصوف سے پوچھ ہی لیا کہ آپ نے اتنی کتابیں کیسے جمع کر لیں، ان کو غصہ آگیا، وہ فرمانے لگے مجھی دو می[2] خون پسینہ ایک کر کے جمع کی ہیں۔

۲۸ - عہد عباسی میں فکری قوتوں کو پروان چڑھانے اور دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا منبع و مخزن کیف دمر در اور سیر و تفریح کا مرکز کتب و کتب خانہ بن گیا تھا، چنانچہ شیخ ابو نصر احمد بن حسین میکالی کا بیان ہے، "ہم بیٹھے ہوئے ایک دن تفریح گاہوں کا ذکر کر رہے تھے بعض کہتے تھے کہ بہترین جگہ غوطۂ دمشق ہے بعض نہر ابلہ کو اچھا بتاتے تھے بعض کا خیال تھا کہ سغد سمرقند تفریح کی اچھی جگہ ہے بعض نہروان بغداد کے قائل تھے، بعض شعب بوان کو پسند کرتے تھے اور بعض نوبہار بلخ کو ترجیح دیتے تھے، ابن درید بولے یہ مقامات آنکھوں کی تفریح کے لیے خوب ہیں، بتاؤ تمہارے قلوب کی تفریح کے لیے کون سے مقامات اچھے ہیں، ہم نے پوچھا ابو بکر (ابن درید) وہ کیا ہیں،

---

[1] آثار البلاد و اخبار العباد تالیف زکریا القزوینی، بیروت، دار صادر للطباعۃ والنشر ۱۳۸۰ھ صفحہ ۳۸۰۔ [2] تاریخ بغداد، ج ۶، ص ۳۳۔

تو بتایا ابن قتیبہ کی عیون الاخبار، ابن داؤد کی کتاب الزہرہ اور ابن ابی طاہر کی کتاب خلق المشتاق اور پھر یہ شعر پڑھے۔

ومن کانت نزہتہ قینہ — وکأس وکاس تصب
اور بعض وہ ہیں جنکی تفریح جام و سبو ہیں — ایک جام انڈیلا جاتا اور دوسرا بھرا جاتا ہے۔
نزہتنا واستراحتنا — تلاقی العیون ودرس الکتب[1]
ہماری تفریح اور آرام و راحت کا سامان — آنکھوں سے دیکھنا اور کتابیں پڑھنا ہیں

ابو بکر ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ نے تحقیق و تدقیق بحث و نظر اور دل و دماغ کی فرحت کا سامان اور فکری قوتوں اور دماغی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کا سرچشمہ کتابوں کو قرار دیا تھا۔

۲۹ - عہد عباسی میں محققین و شائقین کتب کو فیض بخش مراکز علم درسگاہوں، علمی اداروں اور کتب خانوں سے جہاں وہ اور ان کے اساتذہ و اہل علم استفادہ و افادہ کرتے رہتے تھے، اتنی شیفتگی و وابستگی ہو جاتی تھی کہ یہ مراکز عقیدت و محبت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی ویرانی و بربادی پر وہ آبدیدہ ہوتے بعض اوقات وفور غم سے ان کے جذبات شعر کی صورت میں ڈھلکر زبان قلم پر آتے تھے، جو عہد عباسی میں مراکز علم اور کتب خانوں سے پڑھے لکھوں کی عام دلچسپی کا بین ثبوت ہے، چنانچہ مشہور متکلم عبدالکریم شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ کے مندرجۂ ذیل شعر اسی امر کے غماز ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

لقد طفت فی تلک المعاہد کلہا — وسیرت طرفی بین تلک المعالم
میں ان تمام علمی اداروں میں گھوما پھرا — اور میں نے اپنی نظریں ان درسگاہوں میں دوڑائیں
فلم ار الا واضعا کف حائر — علی ذقن او قارعا سن نادم[2]

---

[1] معجم الادباء ج ۶، ص ۴۹۳ - ۴۹۴ [2] کتاب نہایۃ الاقدام فی علم الکلام تالیف عبدالکریم الشہرستانی تحقیق الفرد جیوم بغداد مکتبۃ المثنی۔

(ترجمہ) جس کو بھی دیکھا حیران ٹھوڈی کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے — یا شرم سار یا دانتوں سے انگلی کاٹتے ہوئے

شارح صحیح مسلم یحییٰ بن شرف نوادی (۶۳۱-۶۷۶ھ) دار الحدیث الاشرفیہ[۵۱] میں حدیث کا درس دیتے تھے، ان کی تعلیمی و تدریسی خدمات اور علمی عظمت و شہرت کی وجہ سے اس دار الحدیث الاشرفیہ کو بھی یہ مرتبہ مل گیا تھا کہ علامہ تاج الدین عبد الوہاب سبکی کے باپ فقیہ عصر تقی الدین عبد الکافی المتوفی ۷۵۶ھ کا جب یہاں قیام رہا تو وہ رات کو اس کے ایوان میں آتے تہجد پڑھتے، اور اس آرزو میں اس کے فرش پر جبیں سائی کرتے کہ جہاں امام نووی نے قدم رکھے ہیں، وہاں میری جبین لگ جائے اور میں ان کی برکات سے بہرہ ور ہو سکوں، چنانچہ وہ اپنے فرزند تاج الدین سبکی سے اس عقیدت و حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل اشعار پڑھتے تھے

وفی دار الحدیث لطیف معنی — علی بسط لها اصبو وآوی

دار الحدیث اشرفیہ میں ایک لطیف معنی پنہاں ہیں — میں اس کے فرش پر اٹھتا اور لیٹا رہتا ہوں

عسیٰ لی امس بحر وجهی — مکانا مسه قدم النواوی[۵۲]

امید ہے کہ میرے چہرے کی گرمی — اس جگہ کو چھو سکے جسے نوادی کے قدم نے چھوا ہے

مذکورۂ بالا واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد عباسی میں فیض بخش مراکز علم کو کیسا مقام بلند حاصل تھا۔

---

[۵۱] ب، ت ص ۳، یہ دار الحدیث ابو الفتح الملک الاشرف مظفر الدین موسیٰ بن الملک العادل سیف الدین ابن ابی بکر بن ایوب المتوفی ۶۳۵ھ نے بنوایا اور ۶۳۰ھ میں اسی کا افتتاح کیا تھا، موصوف نے نہایت نفیس کتابوں پر مشتمل کتب خانہ بھی وقف کر دیا تھا۔ (البدایۃ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۴۰) اس کا فرش بھی اسی زمانے کا بچھا ہوا تھا، نووی اس پر قدم رکھتے ہوئے درس حدیث کے لیے آتے تھے۔

[۵۲] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی، مصر، المطبعۃ الحسینیہ، ج ۵ ص ۱۶۶۔

۳۰۔ عہد عباسی میں ذاتی کتب خانے عوامی کتب خانوں کے تمام وظائف تحقیق، تعلیم معلومات، ذوق جمال کی تسکین اور تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتے، اس کی سہولتیں مہیا کرتے تھے، عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے کتب خانے فکری قوتوں کو پروان چڑھانے کے ساتھ تفریح طبع کا سامان بھی مہیا کرنے لگے تھے، چنانچہ فخر الدین مبارک شاہ بن حسین مروزی المتوفی ۶۰۲ھ کے کتب خانہ بغداد میں اہل علم کے لئے کتابیں اور جاہلوں کے لیے شطرنج رکھی گئی تھی۔[۵۳] تاکہ جہلاء کو کتابوں سے قریب لاکر علمی رغبت پیدا کی جا سکے۔

۳۱۔ اس تحریک نے عوام و خواص میں معاشرتی توانائیوں میں مکمل حصہ لینے کا ذوق و شوق پیدا کیا، اور انہیں سرگرم عمل بنایا تھا، اسی لئے ہر جگہ معاشرتی توانائیاں پروان چڑھنے لگی تھیں۔[۵۴]

۳۲۔ مسلم معاشرہ میں خواتین بھی مردوں کی طرح ذوق کتاب داری اور فروغ کتب و کتب خانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھیں۔[۵۵]

۳۳۔ اس تحریک نے متمدن اقوام عالم کے ثقافتی ورثہ کی حفاظت کو تصنیف و تالیف اور ترجمہ کے ذریعہ ان کی علمی تحقیقات کے ابلاغ عام کو مسلم دانشوروں اور مفکروں کا نہایت مقدس فریضہ بنا دیا تھا۔[۵۶]

۳۴۔ بادشاہ و امیر بھی علماء و ائمۂ فن کے کتب خانوں کے حاصل کرنے کے آرزومند اور کوشاں رہتے، گو وہ حاصل کرنے میں مشکل ہی سے کامیاب ہوتے تھے، چنانچہ خلیفہ المتوکل

---

[۵۳] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، ج ۱۲، ص ۲۴۳، العسجد المسبوک والجوہر المحکوک فی طبقات الخلفاء والملوک تالیف الملک الاشرف الغسانی تحقیق شاکر محمود عبد المنعم بغداد، دار البیان ۱۳۹۵ھ ص ۳۲۵ (ذیل وفیات ۶۰۲ھ)

[۵۴] مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی، ص ۲۴۰-۲۴۴، ۲۵۴، ۲۵۶، [۵۵] ایضاً ج ۸ ق ۲، ص ۶۳۷

[۵۶] کتاب الفہرست لابن الندیم مصر مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۴۸ھ، ص ۳۴۰، ۳۴۱، ۴۹۳

المتوفی ۲۴۶ھ نے امام احمدؒ بن حنبل کی وفات کے بعد اپنا خاص ایلچی ان کے فرزند صالح کے پاس حصول کتب ہی کے لئے بھیجا تھا، لیکن ان کے فرزند نے یہ کہلا بھیجا کہ ان کتابوں کی نقول درکار ہوں تو وہ ہمارے پاس کرائی جائیں، یہ کتابیں ہمارے ہی پاس رہنی چاہئیں، ہمیں ان کی روایت کی اجازت حاصل ہے، ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔[۱] ابو حمدان ہر قیمت پر ابن ابی بعرہ کا کتب خانہ حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اس ڈر سے وہ اپنا کتب خانہ کسی کو دکھاتا تک نہیں تھا، لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کا قمطر کبیر ایسا غائب ہوا کہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔[۲]

۳۵۔ کتب خانہ جو اجتماعی و انفرادی ہر حیثیت میں بنی نوع انسان کا ایک نہایت قیمتی تمدنی و ثقافتی ورثہ ہے عہد عباسی میں اس کی حفاظت بنی نوع انسان کا نہایت مقدس فرض سمجھا جانے لگا تھا، حوادث روزگار و آسمانی آفتوں سے اس ورثہ کا بچاؤ ہر وقت پیش نظر رہتا تھا، گاہ بگاہ نقصان ہو جاتا تھا، کتابیں ضائع ہو جاتی تھیں، جب کبھی کسی عالم کو اس صورت سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اسے اور دوسرے علماء کو اس سے جو صدمہ ہوتا تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، عوام کو جیسا کچھ دکھ اس سے پہنچتا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ابو موسیٰ عبد الرحمٰن بن موسیٰ استیجی، امام مالک، سفیان بن عیینہ اور اصمعی وغیرہ کے شاگرد تھے، فقہ، حدیث، لغت و ادب کے امام و حافظ تھے، موصوف نے اندلس سے مشرق کا سفر کیا۔ کتابیں جمع کیں، لے جاتے وقت وہ بحر تدمیر میں ڈوب گئیں جب استیجہ پہنچے اور لوگوں کو اس حادثہ جانکاہ کا علم ہوا تو پورا شہر تعزیت کے لئے امنڈ آیا، اہل استیجہ نے جہاں ان کی بخیر و عافیت واپسی پر مبارک باد پیش کی وہاں ان کی کتابوں کے تلف ہو جانے پر ان کی تعزیت بھی کی، یہ ان سے فرماتے تھے، ذہب الخرج وبقی الدرج، کتابوں کے بورے چلے گئے، دفینہ بہہ گیا۔

---

[۱] ترجمۃ الامام احمد من تاریخ الاسلام للذہبی تحقیق احمد محمد شاکر، القاہرہ، دار المعارف ۱۳۶۵ھ ص ۸۳

[۲] کتاب الفہرست ص ۱۰ ... تاریخ العلماء و الرواۃ للعلم بالاندلس تالیف عبد اللہ بن محمد ابن الفرضی تحقیق عزت [illegible]

جو سینہ میں تھا وہ رہ گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد عباسی میں بنی نوع انسان کے علمی و ثقافتی ورثہ سے محبت ہر ایک کے دل میں کیسی رچ بس گئی تھی کہ ہر ایک کو اس ذخیرہ کے تلف ہو جانے کا صدمہ تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک سے علمی و کتابی ضرورتوں کو پورا کرنے کا شوق و ذوق معاشرہ کے ہر فرد میں کتنا فروغ پا چکا تھا، کسی کی کتابیں ضائع ہو جاتیں تو اس کے ضیاع پر لوگ اس کے گھر پہنچتے اور اس کے غم میں شریک ہوتے تھے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریک شاہ سے گدا تک عام ہو گئی تھی، اس تحریک نے اس دور کے مسلم معاشرہ کو اتنا حساس بنایا اور افراد کے تحت الشعور میں کتب و کتب خانوں کی قدر و منزلت اتنی بڑھا دی تھی کہ ابو موسیٰ عبد الرحمٰن کے ذخیرۂ کتب کے ضیاع کو عبد الرحمٰن کی آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی سمجھا گیا تھا، دنیا کی کسی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ کسی غیر مسلم معاشرہ میں کبھی کتب خانہ کے فروغ کا اتنا شعور پیدا ہوا ہو جتنا عباسی دور میں پیدا ہو چکا تھا،

۳۶۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بغداد کے عوامی کتب خانوں میں متمدن اقوام عالم کے علوم و فنون کے ایسے بیش بہا نوادر جمع کئے گئے تھے کہ ان علوم و فنون کا دلدادہ جب انھیں دیکھ پاتا تو وطن اور اہل و عیال ہی کو نہیں حقیقی کعبہ کو بھی بھول جاتا اور یہاں اپنا مقصود پا کر اسی کا ہو رہتا تھا، چنانچہ ابو معشر فلکی جو بلخ کا باشندہ تھا، حج کے لیے جاتے ہوئے جب راستے میں بغداد سے گزرا اور علی بن یحییٰ المنجم المتوفی ۲۷۵ھ کا کتب خانہ دیکھا تو اسی کو دل دے بیٹھا، اور کعبۃ اللہ کو جانا ہی بھول گیا تھا۔[۱]

---

[۱] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۶۷۔

یاقوت رومی جب مرو پہنچا اور یہاں کے عوامی کتب خانوں کو اور ان سے استفادہ کی سہولتوں کو دیکھا تو اہل و عیال کو بھول گیا، یہاں سے نکلنا ہی نہ چاہا، چنانچہ کہتا ہے کہ بلاد اسلامی پر تاتاریوں کی مسلسل یورش نے مجھے مرو شاہجہان کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا ورنہ میں مرتے زندگی بھر نہ نکلتا، اس کی یاد میں یاقوت کی زبان و قلم سے جو درد انگیز شعر نکلے ہیں، وہ پڑھنے کے لائق ہیں، اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ جہاں کتب و کتب خانے ہوتے تھے، اہل علم اس سرزمین کے گرویدہ رہتے، اور وہیں زندگی کے دن پورا کرنے کی آرزو کرتے تھے[1]۔

۳۷۔ کتب خانوں کی ترقی اور علمی کارناموں کی وجہ سے مشرق و مغرب (یورپ اور ایشیا) کے نامور خلفاء میں باہم موازنہ و مقابلہ کیا جاتا، اور ایک کو دوسرے کا نظیر و مثیل قرار دیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مشرق میں خلیفہ الناصر، المستضئی عباسی کو حکم ثانی کا نظیر و مثیل بتایا ہے[2]۔

۳۸۔ علم و کتاب کی اشاعت اسلام کی اشاعت سے عبارت تھی اسی لیے ارباب سیف اور اصحاب قلم میں مقابلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرطبہ کے اندر اسلام کی خدمت کرنے میں اصحاب الکتب (کتب خانے والوں) اور اصحاب الکتائب (لشکر والوں) کے اندر مقابلہ ہوتا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا[3]۔

۳۹۔ عربوں کو اپنے تہذیبی و ثقافتی مرکز اور علمی سرمایہ سے بہت محبت ہوگئی تھی، وہ اپنی اولاد کو ہتھیاروں اور کتابوں کے بازاروں میں جانے کی تاکید کرتے تھے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں سیف و قلم کے بازار ہی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور انہی کی طرف لوگوں کو جانے کی ترغیب دی جاتی تھی یہ ترغیب کتب کتب خانوں کی نشر و اشاعت اور شہرت کا باعث رہی ہے[4]۔

---

۱ معجم البلدان لیاقوت، بیروت، دار صادر للطباعۃ والنشر، ۱۳۷۶ھ ج ۵ ص ۱۱۴ ۲ تاریخ ابن خلدون ط ۳ بیروت، دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء ج ۴ ص ۳۱۶ ۳ نفح الطیب للمقری، ج ۲ ص ۹۵ ۴ رسالۃ فی مدح الکتب والحث علی جمعہا للجاحظ تحقیق ابراہیم السامرائی، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ج ۷ ص ۳۳۰، العقد الفرید لابن عبد ربہ تحقیق احمد امین وغیرہ، ط دوم، القاہرۃ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر ۱۳۷۵ھ ج ۲ ص ۲۱۰ ۵ الخطط المقریزیۃ القاہرۃ، دار الطباعۃ المصریۃ، بولاق ۱۲۷۰ھ ج ۲ ص ۱۰۲

۴۰۔ عالم، جاہل، امیر، غریب، بادشاہ اور فقیر کے کتب خانے کے ذخائر کی کمیت و کیفیت کا تذکرہ کتبِ تاریخ و تذکرہ میں کیا جاتا تھا جو عوام و خواص میں قیامِ کتب خانہ کی ترغیب کا موجب رہا ہے[1]۔

۴۱۔ عہد عباسی میں عوامی کتب خانوں کا طریقہ عام ہوگیا تھا، مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں تمام ممالک اسلامیہ میں سینکڑوں ہزاروں کتب خانے قائم ہوگئے، کتب خانوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانہ کے قریب مدرسوں اور یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی اور ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ہونا ایک لازمی بات قرار پائی[2]۔

۴۲۔ اہل علم اس لیے بھی اپنی کتب و نگارشات وقف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے کہ اس سے وہ محفوظ ہو جاتی تھیں، انھیں ان کے ضائع نہ ہونے اور آیندہ نسلوں تک بحفاظت پہنچتے رہنے کا اطمینان ہو جاتا تھا[3]۔

۴۳۔ مسلمانوں کو کتب و کتب خانوں سے عقیدے کی سی والہانہ محبت تھی، انھوں نے ان کو اسی طرح حرز جان بنائے رکھا، جس طرح انسان عقیدے کو حرز جان بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس حقیقت کا ذکر ڈاکٹر اولگا پنٹو نے Cult of Books (کتابی تہذیب) کے الفاظ سے کیا ہے[4]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ج ۳ ص ۱۰۳۵، ۲ نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ۱۰ و ۱۱ ۳ مقالات شبلی اعظم گڑھ مطبع معارف ۱۳۷۱ھ ج ۶ ص ۱۶۷ ۴ Four great libraries of Medieval Baghdad by Ruth Slellhorn Mackensen library Quarterly Vol.II,1932 The libraries of the Arabs during the time ۵ of the Abbassides Pakistan library Review مارچ، جون، جلد ۱۱ شمارہ نمبر ۱ و ۲ ص ۳۵۔

۴۴ ۔ وزراء، امراء اور کتابوں کے شوقین دولت مند کتابوں کے ملنے پر کتاب پیش کرنے والے کو انعام وخلعت سے سرفراز کرتے تھے[1]، چنانچہ وزیر کمال الدین امین الدولہ دمشقی المتوفی ۶۴۸ھ نے ابن ابی اصیبعہ کو طبقات الاطباء کے پہنچانے پر انعام وخلعت سے سرفراز کیا تھا[2]۔

۴۵ ۔ بادشاہوں کی ریس میں وزیر امیر بھی اپنے کتب خانوں میں محققین وشائقین کتب کی سہولت واستفادہ کی خاطر دوسری صدی ہجری سے کتب خانہ میں کتاب کے تین تین نسخے رکھنے لگے تھے، تاکہ تحقیق، تصحیح ونقل میں ان مختلف نسخوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکے، چنانچہ وزیر ابوالفضل یحییٰ بن خالد برمکی المتوفی سنہ ۱۹۰ھ کے خزانۃ الکتب وبیت المدارسہ میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا تھا، محمد بن عبدالملک الزیات[3] کے کتب خانہ میں بھی کتابوں کے متعدد اور اہم نسخے رکھے جانے کا اہتمام کیا جاتا تھا[4]۔

۴۶ ۔ اوائل عہد عباسی سے اہل ثروت کتب خانوں میں ذخائر کے اندر اضافہ کی خاطر وراق رکھتے تھے، اہل علم کو ان کے کتب خانوں سے استفادہ کی سہولت حاصل ہوتی تھی، بایں ہمہ نادار اہل علم اپنا کتب خانہ بنانے اور اپنے ذخائر کتب میں تنوع وکثرت کے لئے خود اہل ثروت کے کتب خانوں سے کتابیں نقل کرتے تھے، چنانچہ عامر بن ابراہیم بن واقد مولیٰ ابوموسیٰ اشعری رض المتوفی سنہ ۲۰۱ھ یا ۲۰۲ھ ہیزم فروش علم وکتب کے شیدائی تھے، موصوف نے یعقوب قمی کے پاس ایک ماہ قیام کیا اور ان کے کتب خانے سے کتابیں نقل کیں، پھر نعمان بن عبدالسلام کے کتب خانے میں جاکر ان کی کتابیں نقل کیں، لوگوں نے ان سے

---

[1] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۵۰۰، ۶ ۔ [2] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ بیروت، دارالفکر سنہ ۱۳۷۶ھ ج ۳ ص ۲۸۶ - ۲۸۷ ۔ [3] کتاب الحیوان، ج ۱ ص ۲۰ ۔

[4] انباہ الرواۃ للقفطی، ج ۳ ص ۱۵۱، معجم الادباء ج ۳ ص ۸۵ - ۸۶ ۔

پوچھا آپ کتابیں کیوں نقل کرتے ہیں، جواب دیا میں جن کے ذخیرۂ کتب سے کتابیں نقل کرتا ہوں، ان کے پاس (کتب خانہ، وراق ہیں) میرے پاس وراق نہیں، میں اپنے لیے خود کتابیں نقل کرکے ذخیرہ کرتا اور کتب خانہ بناتا ہوں، اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اندر اہل علم کو ذاتی کتب خانوں سے نقل واستفادہ کی سہولت حاصل تھی[1]۔

۴۷ ۔ تعلیم، کتابت وقرأت اور کتابوں میں انہماک کو ریاست وسیاست اور زہد وپرہیزگاری کی اصل سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابوعلی صالح بن محمد المتوفی سنہ ۲۹۴ھ کا بیان ہے، بغداد میں محدث اور معتزلی دو شاعر تھے، معتزلی میرے پاس سے گزرا اور مجھے لکھتے ہوئے دیکھکر کہنے لگا، صاحبزادے کتنا لکھوگے آنکھیں جاتی رہیں گی، کبڑے ہوجاؤگے اور وقت سے پہلے چل بسوگے پھر اس نے مجھ سے کتاب لیکر اس پر حسب ذیل شعر لکھے۔

ان القرأة والتفـ قه والتشاغل بالعلوم

پڑھنا، تفقہ حاصل کرنا اور تحصیل علوم میں لگے رہنا۔

اصل المذلة والاضا فة والمعانة والهموم

ذلت، فقر وفاقہ، مشقت اور غموں کی جڑ ہے۔

اس کے بعد محدث کا گزر ہوا، اور اس نے یہ شعر پڑھا، تو فوراً کہا اس دشمن جاں نے غلط کہا ہے۔

"بل یرتفع ذکرک، وینشر علمک، ویبقی اسمک مع اسم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الی یوم القیامة" بلکہ یہ انہاک علمی اور لکھنا پڑھنا تمہاری شہرت کا، تمہارے علم کی نشر واشاعت کا اور تمہارے نام کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ

---

[1] ذکر اخبار اصبہان تالیف ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی، لندن مطبعہ بریل ۱۹۳۲ء ج ۲ ص ۳۶

تاقیامت باقی رکھنے کا باعث ہے، پھر اس نے یہ شعر لکھے۔

ان التشاغل بالدفا … تر والکتابة والدراسة

بلاشبہ کتابوں میں نقل وکتابت میں اور تعلیم وتعلم میں انہماک و سرگرمی

اصل التقیة والتنز … هد والریاسة والسیاسة[۱]

زہد و پرہیزگاری اور ریاست وسیاست کی اصل وبنیاد ہے۔

۴۸۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علماء واہل ثروت کی حویلیوں اور محلسراؤں نے عارضی علمی اداروں کی صورت اختیار کرلی تھی، وہ علوم وکتب کی نشرواشاعت میں اہم کردار ادا کرتے تھے، ان میں اہل علم اور وراقوں کے شب میں قیام کے واسطے چالیس پچاس بستر تیار رکھے جاتے تھے، چنانچہ حافظ ابو یوسف یعقوب بن شیبہ سدوسی نزیل بغداد (۱۸۲-۲۶۲ھ / ۷۹۸-۸۷۵ء) کے یہاں چالیس بستر صرف وراقوں کے واسطے رات میں استعمال کے لیے مخصوص تھے[۲]، نامور مصنف وادیب ابو عبید محمد بن عمران مرزبانی (۲۹۶-۳۸۱ھ / ۹۰۹-۹۹۴ء) نے اپنی حویلی میں پچاس بستر اہل علم کے واسطے رات میں قیام کے لیے رکھے تھے۔[۳]

مورخ صفدی نے اس تفصیل میں پڑے بغیر موصوف کی حویلی کے متعلق اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، "کان دارہ مجمع الفضلاء"[۴] مرزبانی کی حویلی اہل علم کی اکیڈمی تھی، اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ تذکرہ نگار و مورخین اس قسم کے عارضی علمی اداروں کیلئے جو علوم وکتب کی نشرواشاعت میں سرگرم عمل تھے اور جہاں شب گزاری کے لیے بستر بھی

؎۱ تاریخ بغداد، ج ۹ ص ۲۲۳ ؎۲ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۰۱، کتاب المنتظم ج ۵ ص ۴۳
؎۳ ایضاً ج ۳ ص ۱۳۶، میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبی تحقیق علی محمد البجاوی، مصر عیسی البابی الحلبی، ۱۳۸۲ھ ج ۳ ص ۶۷۲ ؎۴ کتاب الوافی بالوفیات تالیف صلاح الدین خلیل الصفدی، نیسبادن دار النشر فرانز شتاینز ۱۳۸۱ھ ج ۴ ص ۲۳۶

کثیر تعداد میں تیار رکھے جاتے تھے، "دارہ مجمع الفضلاء"، "دارہ مجمع العلماء"[۴] کے الفاظ سے ذکر کرتے تھے،

نامور فقیہ ابوالفرج احمد بن محمد بن عمر بن الحسن بغدادی حنفی المعروف بابن المسلمہ (۳۳۷ھ - ۴۱۵ھ) کا مکان جو شرقی بغداد میں درب سلیم کے اندر واقع تھا کے متعلق مورخ خطیب بغدادی کا بیان ہے، "کان دارہ مالفاً لاہل العلم" موصوف کا مکان اہل علم کی اکیڈمی تھا،[۱]

۴۹۔ تیسری صدی ہجری میں جو علماء وقضاۃ پرورش لوح وقلم کرتے، اہل علم ومصنفین کی اعانت وحاجت روائی کرکے فروغ کتب وکتب خانوں کی راہ ہموار کرتے ان کے لیے بھی "مالف" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، چنانچہ قاضی ابوعبداللہ احمد بن ابی دواد بن جریر ایادی بصری ثم بغدادی معتزلی المتوفی ۲۴۰ھ کا شمار اسی قسم کی معارف پرور شخصیات میں تھا، ابوبکر بن درید المتوفی ۳۲۱ھ حسن بن خضر سے ناقل ہیں۔

کان ابن ابی دواد مالفاً لاهل
آلادب من ای بلد کانوا
وکان قد ضم الیه جماعة
یعولهم ویمونهم،[۲]

ابن ابی دواد اہل ادب کی محبت و
الفت کا مرکز تھا خواہ وہ کسی شہر
اور کسی دبستان فکر سے تعلق رکھتے
ہوں، ایسی ایک جماعت اس سے وابستہ
تھی اور وہ ان کی حاجت روائی وکفالت کرتے تھے

۵۰۔ عہد عباسی میں تصنیف وتالیف اور کتابت ووراقت، ذخیرۂ کتب وکتب خانہ سازی میں

؎۱ کتاب منتظم، ج ۶ ص ۸۸ ؎۲ تاریخ بغداد ج ۵ ص ۰۰۰، النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۳۴۰، ذیل وفیات ۲۱۵ ؎۳ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۵۱
الطبقات السنیة فی تراجم الحنفیة تالیف عبد القادر التمیمی تحقیق عبد الفتاح محمد الحلو، القاہرہ المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ، ۱۳۹۵ھ ج ۱ ص ۳۴۰

اس لیے بھی اضافہ ہوا کہ ان کا شمار علوم نافعہ میں کیا گیا ہے، ان کا نفع دائمی ہے، یہ دنیا و آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہیں، اس لئے ان کی طرف توجہ دلائی جاتی، اور ترغیب دی جاتی تھی، عرب کا شاعر کہتا ہے

ما من کاتب الا سیبقی	کتابتہ وان فنیت یداہ
کاتب کی تحریر باقی رہ جائے گی	اگرچہ اس کے ہاتھ فنا ہو جائیں گے
فلا تکتب بکفک غیر شیئ	یسرک فی القیامۃ ان تراہ[1]
اس لئے تم اپنے ہاتھ سے ایسی چیز یادگار چھوڑو	جسے تم قیامت کے دن دیکھ کر خوش ہو،

۵۱ - عہد عباسی میں چوتھی صدی ہجری کے اندر علم، مدرسہ، قلم و دوات اور کتاب کی طرف عزیزوں اور نوجوانوں کو رغبت دلائی جاتی اور ان باتوں کی نصیحت کرکے کتب و کتب خانہ سے ان کی دلچسپی بڑھائی جاتی تھی تاکہ ان کی علمی ترقی برقرار رہے، اور کتب و کتب خانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ چنانچہ بدیع الزماں ہمدانی، المتوفی ۳۹۸ھ اپنے بھانجے کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

انت ولدی مادمت والعلم شانک	تم میرے بیٹے ہو جب تک علم تمھاری
والمدرسۃ مکانک والمحبرۃ	شان اور مدرسہ تمھارا مکان ہے،
حلیفک والدفتر الیفک فان	دوات و قلم تمھارا ساتھی اور کتاب تمھاری
قصرت ولا اخالک[2]	دوست ہے، تم اس میں کوتاہی کرو تو
	پھر تمھارا کوئی مددگار نہ ہو۔

عہد عباسی میں علمی و کتابی ضرورت کی تحریک کے فروغ اور اس کے بنیادی عوامل کو

---

[1] کتاب العقد الفرید ج ۴ ص ۲۰۸ [2] الرسائل لبدیع الزماں الہمدانی، ط ۳، القاہرہ، مطبعۃ ہندیہ، ۱۳۲۹ھ ص ۱۵۲۔

مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے، یہ ایک ایسا جام جم ہے جس کے اندر عہد عباسی کی پوری علمی زندگی صاف صاف نظر آتی ہے۔ کتب خانوں کی تاریخ میں اسلامی دور سے پہلے اس طرح کے عوامل نہ کہیں رومیوں میں نظر آتے ہیں، نہ ایرانیوں میں، نہ یہ ہند و سندھ میں کارفرما دکھائی دیتے ہیں، نہ ان کی روشنی سے یونان و مصر روشن ہوا ہے، نہ نینوا و بابل میں یہ عوامل کبھی سرگرم عمل دیکھے گئے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو کتب خانے (GIAYTABTATEC) گلی گلی (STREETS) نظر نہ آتے۔ یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ابلاغ کو اتنا عام کیا اور علم کی ایسی اشاعت کی، کہ گلی گلی تو کیا گھر گھر کتب خانہ نظر آنے لگا، چنانچہ کتب خانہ سازی عہد عباسی میں ایک عالمگیر تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، امیر غریب، چھوٹا بڑا، عورت مرد ہر ایک اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا، براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ تک یہ تحریک بارآور ہوئی، ہر جگہ پھولی پھلی، شاہی محلات میں بسیرا کیا، وزیروں کے ایوانوں میں رہی، امیروں کے محلوں میں پروان چڑھی، فقیروں کے جھونپڑیوں میں پلی بڑھی، عالم، ادیب، فقیہ، مفسر، شاعر، مفکر، حکیم، صوفی، لغوی، نجومی، مورخ، مہندس، خطاط، وراق، فنکار، صنعت کار، تاجر، مسلمان، عیسائی، یہودی، دیندار، دنیادار، دہریہ، زندیق، پڑھے لکھے، حتی کہ بعض بے پڑھے لکھے کے ٹھکانے میں اپنا ٹھکانا بنایا، نظریاتی طور پر مخالف و برسرپیکار گروہوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا، ہر ایک کے دل و دماغ کو اس تحریک نے شعوری و غیر شعوری طور پر متاثر کیا، عہد عباسی میں ہر شہر، قریہ، بستی، محلہ، گلی، کوچہ، معبد، مسجد، تکیہ، سرائے، محل سرا، مہمان خانہ، خانقاہ، سیرگاہ، گلستاں، قبرستان، دریا کے کنارے، مدرسے، ادارے، بازار، کان، ہر چھوٹی بڑی مرکزی جگہ میں اس نے اپنا علمی مظاہرہ کیا، اور کتب خانہ قائم کر دکھایا۔ بادشاہ سے فقیر تک ہر ایک کے یہاں اس کا بول بالا رہا، اسی لئے مذکورہ بالا ہمہ اقسام کے کتب خانوں کا تذکرہ ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ اسلامی ہوا نہ عہد عباسی میں کیا،

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی قرآن فہمی

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبہ عربی امر سنگھ سری نگر

علامہ محمد انور شاہ اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ قرآن میں دنیا بھر کا رطب و یابس موجود ہے؛ وہ زور دار الفاظ میں ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نیوٹن کا نظریۂ تجاذب، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، آئنسٹائن کا نظریۂ اضافیت وغیرہ ٹٹولتے ہیں، اُن کے نزدیک یہ قرآن کی خدمت نہیں ہے بلکہ اس سے زیادتی ہے، وہ جانتے تھے کہ سائنسی انکشافات میں کوئی دوام و ثبات نہیں ہے، بلکہ روز بروز بدلتے رہتے ہیں، آج جن باتوں کو بڑھ چڑھ کر پیش کیا جاتا ہے کل انھیں مسترد کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی رائے عصر حاضر کے نامور علماء کی آراء سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے، آیت شریفہ:- وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (یٰسٓ) پر تقریر فرماتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لو كان الشرع بنى كلامه في	اگر شریعت نے اپنا کلام علوم کائنات
الكونيات على الواقع حقيقة	کی حقیقت واقعی پر قائم کیا ہوتا تو
لبقي القرآن مكذبا عندهم	ہمیشہ قرآن اُن کے نزدیک ناقابلِ
الى ان يظهر لهم الواقع	اعتبار ٹھہرتا، جیسا کہ اسی مسئلہ حرکت
ايضا، كما هو عندهم	کے بارے میں ان کے متضاد خیالات

الى ان يظهر لهم الواقع ايضاً	اگر شریعت نے اپنا کلام علوم کائنات
كما هو عندهم لمسئلة الحركة	کی حقیقتِ واقعی پر قائم کیا ہوتا، تو
هذه، فانه لو كان القرآن	ہمیشہ قرآن اُن کے (یعنی فلاسفہ اور
صدع بحركة الارض مثلاً	سائنسدانوں کے) نزدیک ناقابلِ
لبقي مكذبا فيمن مضوا من	اعتبار ٹھہرتا، جیسا کہ اسی مسئلہ حرکت
الفلاسفة لعدم ثبوتها	کے بارے میں ان کے متضاد خیالات
عندهم وان صدقه	سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً اگر قرآن
الناس اليوم، وكذا لو صرح	نے زمین کے متحرک ہونے کا اعلان
بحركة الفلك لصدقه الفلاسفة	کیا ہوتا تو وہ فلاسفہ اس کو جھٹلاتے
البتة ولكن صار اليوم مكذبا	جو زمین کی حرکت کے قائل نہیں تھے
لا يعتقد به احد لثبوتها	اس کے برخلاف آج اس کی کھلی تصدیق
عندهم بخلافه. فاغمض	ہوتی، اسی طرح اگر قرآن نے حرکت
القرآن عن نحو تلك الكونيات	فلک کی بحث چھیڑی ہوتی، تو فلاسفہ
التي تتعلق له بها غرض في	متاخرین اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے،
اعمالنا ليسوى امرها عند	جبکہ عصر حاضر کے محققین اس کی تکذیب
هؤلاء ولا يحول تلك المباحث	کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق قدما کی
بينه وبين ايمانهم، ولعمري	تحقیق کے خلاف ہے، اسی لئے قرآن
هذا هو الاحسن[1]	نے کونیاتی مباحث نہیں چھیڑے ہیں۔

[1] فیض الباری: ج ۴ ص ۲۲۴،

"تاکہ ان کا معاملہ ہر دور کے لوگوں کیساتھ
رہے، اور یہ مباحث لوگوں اور اُن کے ایمان
کے درمیان حائل ہو جائیں، اپنی عمر کی
قسم یہی بہترین طریقہ ہے۔"

ان کی اس رائے کو عصر حاضر کے نامور مفسر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"قرآن کا بہت بڑا اعجاز (کہنا چاہئے کہ شاید سب سے بڑا اعجاز) یہ ہے کہ اس نے عقلی علوم اور ترقی پذیر علوم کے مسائل کے باب میں بڑی ہی لچک روا رکھی ہے کہ جو مسئلہ جس طرح اس کے نزول کے وقت علوم عصری کے عین مطابق نظر آتا تھا، اسی طرح آج چودہ سو سال کے بعد بھی معاصر تحقیق کے عین مطابق ہے، .... اس صورت حال کا راز صرف یہ ہے کہ قرآن نے مغیبات کا تو پورا اور کافی علم دیدیا ہے ..... باقی جتنے علوم و فنون کا تعلق انسان کے عقل، ذہن اور دماغ سے ہے، اور اُن کے مجموعے کا نام خواہ فلسفہ رکھئے یا سائنس، اُن کی جزئی تفصیلات کی طرف تو قرآن گیا ہی نہیں، بلکہ صرف مجمل اشارات ان کے متعلق کر دیئے ہیں، ...... یہ بنیادی حقیقتیں اگر پیش نظر رہیں، تو انشاء اللہ تفہیم قرآن میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی، اور تفسیر قرآن بجائے ایک "خشک" سے موضوع کے ہم دنیا والوں کے لئے بھی بڑا دلچسپ بن جائے گا۔"[1]

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ بھی قرآن میں سائنس و فلسفہ کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر

---

[1] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۷ (افتتاحیہ)

نکالنے کے سخت خلاف ہیں، یہاں تک کہ وہ اضافی حد تک بھی اس قسم کا استفادہ کرنے سے روکتے ہیں[1] مولانا عبدالباری ندویؒ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بھی یہی خیال نقل کیا ہے[2] مولانا آزاد مرحوم بھی اپنے ایک مکتوب میں اسی قسم کی رائے ظاہر کرتے ہیں[3] گو افسوس یہ ہے کہ ترجمان القرآن میں وہ اس رائے پر قائم نہیں رہے ہیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک قرآن کا کام یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان کو طبیعیات، کیمیا، ہیئت، ہندسہ اور تاریخ وغیرہ پر درس دے، یا ان علوم کے مسائل و قواعد پر بحث کرے۔ ان کی رائے میں:-

"قرآن کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدا و معاد اور معاش نیز فلاح و نجاح دنیا و آخرت وابستہ ہو"[4]

یا جیسا کہ مولانا دریابادیؒ نے فرمایا ہے:

"قرآن وقت کے چلے ہوئے اور اصطلاحی مفہوم میں کوئی علمی "ادبی" یا "تحقیقی" مقالہ نہیں، اصلاً وہ محض کتاب ہدایت ہے، یا انسانی زندگی کا انفرادی یا اجتماعی دستور العمل، اس کی دنیا سر تا سر حکمت و اخلاق، روحانیت، عبدیت اور انابت کی دنیا ہے"[5]

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت الاستاذ (مولانا محمد انور شاہ) عربی کے اس شعر کے متعلق:-

---

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۴۵ [2] جامع المجددین مولانا عبدالباری ندوی ص ۳۵،
[3] تبرکات آزاد: مولانا غلام رسول مہر: ص ۳۵، حیدرآباد، [4] یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص ۶۵ [5] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۶۔

جمیع العلوم فی القرآن لکن　　تقاصر عنہ افہام الرجال

فرماتے تھے کہ کسی غبی کا شعر ہے، اور زیادہ جلال آنے پر اس شعر کے کہنے والے کو غبی الاغبیاء کہتے تھے۔[50]

ناسخ و منسوخ قرآن کے مسئلہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ وحی متلو میں منسوخ فی الحکم کچھ بھی نہیں ہے، ان کے نزدیک لفظ نسخ کے معنی و مفہوم مختلف زمانوں میں مختلف رہا اسی لئے آیات قرآنی کے منسوخ اور غیر منسوخ کا مسئلہ بھی پیچیدہ رہا، جن علماء نے بہت سی آیتیں منسوخ قرار دی ہیں، ان کے ہاں نسخ کا معنی مطلق کو مقید اور عام کو خاص کرنا پیش نظر تھا، آگے جن علماء نے مسئلہ نسخ کی مزید تنقیح کرکے نسخ سے مشروعیت کا دور کرنا مراد لیا، ان کے یہاں منسوخ آیات کی تعداد بھی سمٹ کر رہ گئی، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی صرف اکیس ۲۱ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی چھ آیات کے منسوخ ہونے کے قائل ہو گئے، انھوں نے بقیہ آیات کی اس طرح تفسیر بیان کی کہ وہ بھی محکم بن گئیں، جب محققین نے نسخ سے مختلف معنی مراد لئے تو وہ منسوخ اور غیر منسوخ آیات کی تعیین اور تعداد میں بھی مختلف الرائے ہوئے اس کو مدنظر رکھ کر علامہ فرماتے ہیں:

انکرت النسخ راسًا وادعیت	میں نسخ سے مطلق انکار کرتا ہوں اور
انّ النسخ لم یرد فی القرآن	دعوی کرتا ہوں کہ نسخ قرآن پر وارد
راسًا۔ اعنی بالنسخ کون	ہی نہیں ہوتا ہے، نسخ سے میں یہ معنی
الآیۃ منسوخۃ فی جمیع ما	لیتا ہوں کہ کوئی آیت اپنے تمام جزئیات
حوتہ بحیث لا تبقی معمولۃ	کے ساتھ منسوخ ہو اور اس کا کوئی پہلو

۵۰ حیات انور، مقالہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی،

فی جزئیٍ من جزئیاتھا۔ فذلک	قابل عمل نہیں رہا ہو، اور یہ میرے
عندی غیر واقع وما من آیۃ	نزدیک صحیح نہیں ہو۔ قرآن میں ایسی
منسوخۃ الا وھی معمولۃ	تمام آیتیں جو منسوخ کہلائی جاتی
بوجہ من الوجوہ وجھۃ من	ہیں کسی نہ کسی پہلو اور کسی نہ کسی جہت
الجہات[51]	سے (اب بھی اور ہر وقت) قابل عمل ہیں

ناسخ و منسوخ کی بحث اور امام سیوطی اور محدث دہلوی کی تنقیح و تفسیر سے مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ایک اور چیز اخذ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اس بحث و تنقیح سے تفسیر بالرائے کی حقیقت کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے قدیم مفسرین کرام نے اپنی آراء اور تحقیقات سے قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی، بعض علماء نے ایسی آیتیں منسوخ سمجھ لی ہیں جنھیں دوسرے علماء نے اپنی تحقیق کے مطابق محکم قرار دیا، مگر اس کے باوجود کوئی اسے تفسیر بالرائے نہیں سمجھا، جس پر حدیث میں وعید آئی ہے، تو جب یہ حقیقت ہے کہ

فان کنت عارفًا باللغۃ وبالادوات	قرآن کے مدعا کی وضاحت کے لئے زبان
التی لابد منھا لبیان مراد القرآن	اور تفسیری علوم و قواعد سے واقفیت
فلک ان تفسرہ بما رایت مالم	ضروری ہے، اگر تم ان سے واقف ہو تو
یؤد الی تغییر فی عقیدۃ او	قرآن کی تفسیر و تشریح کر سکتے ہو اگر
تبدیل فی مسئلۃ مسلمۃ[52]	اس طرح کہ اسلامی عقائد اور مسلمہ مسائل
	میں کوئی تحریف، تغییر واقع نہ ہونے پائے،

چند مفسرین کرام اور ان کی تفسیر کے بارے میں رائے مشکلات القرآن دیکھتے ہی نظر آتا ہے کہ اُن کی نظر

۵۱ فیض الباری ج ۳ ص ۱۴۹　۵۲ ایضاً

تفسیری ذخائر پر کس قدر وسیع اور عمیق تھی، متقدمین کی جو تفسیریں مشہور و مقبول ہیں، مشکلات القرآن میں ان کا حوالہ ملتا ہے اور جس تفسیر سے جو مراد حاصل کرنا ہوتا ہے اسے تفخر کے ساتھ لیتے ہیں، تفسیروں میں وہ سب سے زیادہ متاثر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی نامکمل فارسی تفسیر "فتح العزیز" سے تھے، ان کی رائے میں اگر شاہ صاحب دہلوی کی یہ تفسیر مکمل ہوتی تو ذخیرۂ تفاسیر میں اس کا وہی مقام و مرتبہ ہوتا جو شرح بخاری میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری کو حاصل ہوا اسی وجہ سے ان کی رائے میں امتِ محمدیہ میں سے کسی نے بھی قرآنی مشکلات کے ساتھ اس طرح اعتنا نہیں کیا ہے، جس طرح علم حدیث کے ساتھ کیا گیا ہے، محدث بنوری نقل کرتے ہیں:

وکان یقول ان مشکلات القرآن	فرماتے تھے قرآن کی مشکلات
تربو علی مشکلات الحدیث	حدیث کی مشکلات سے زیادہ ہیں
ان الاسف علی ان الامۃ المرحومۃ	مگر افسوس یہ ہے کہ امتِ محمدیہ
لم تخدم القرآن مثل خدمۃ الحدیث	نے حدیث کی جتنی خدمت انجام
وکان الاعتناء بہ اھم منہ	دی، اتنی قرآن کی نہیں دی ہے،
بالحدیث۔۔۔ وانہ لیس فی	حالانکہ حدیث سے زیادہ قرآن سے
ذخیرۃ التفاسیر المطبوعۃ تفسیر	اعتنا کرنا اہم اور ضروری تھا۔۔
للقرآن یوازی فی الرتبۃ	۔۔ مطبوعہ ذخیرۂ تفاسیر میں ایسی
فتح الباری لصحیح البخاری	کوئی تفسیر نہیں ہے، جو علم حدیث میں ابن حجر
حاویا لمزایاہ و صادعا	کی فتح الباری کے برابر ہو، اور جو قرآن کے
بغوامضہ۱؎۔	تمام پہلوؤں پر محیط اور اس کے غوامض کو کھول دے

(ترجمہ)

۱؎ فیض الباری ج ۳ ص ۱۴۹،

تفسیر عزیزی کے بعد وہ زیادہ اعتماد تفسیر ابن کثیر اور تفسیر البحر المحیط پر کرتے ہیں، بالخصوص جہاں عقائد کی تائید و توثیق کی ضرورت ہوتی ہے تو انہی دو تفسیروں پر نظر پڑتی ہے، قرآن کے نحوی مباحث اور ادبی خوبیاں بیان کرتے وقت علامہ ابوالقاسم جاراللہ زمخشری کے اقوال کو حرفِ آخر کی حیثیت دیتے ہیں، وہ تفسیر کشاف پر اس طرح مٹے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مصنف کے اعتزال پر رحم کھانے کے لیے بھی تیار ہوئے ہیں، جن آیات کا تعلق معارف و حقائق کے ساتھ ہوتا ہے، وہاں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی الفتوحات المکیہ کو بار بار اپنی پناہ گاہ بناتے ہیں، آیت وعلم آدم الاسماء کلھا تقریباً سارے مفسرین نے اسمار اشیار سے حقائق اشیاء مراد لیا ہے، یعنی اللہ تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کو نہ صرف اشیار کے نام سکھائے، بلکہ ان ناموں کے حقائق سے بھی آگاہ کیا، مگر علامہ محمد انور شاہؒ لکھتے ہیں۔

لم یذکر حقائق الاشیاء۲؎ اشیار کے حقائق ذکر نہیں کئے ہیں۔

۲؎ مشکلات القرآن ص ۵ ۔ علامہ محمد انور شاہؒ کی یہ تفسیر (حقائق اشیا کا عدم ذکر) طبعیات کی جدید تحقیقات کے مطابق نظر آتی ہے، طبعیات کے جدید فضلار اعتراف کرتے ہیں کہ طبعیاتی دنیا میں ان کی تحقیقات کی ساری کوششیں علامات یا اسمار تک محدود ہیں، اور ان اسمار کے حقائق کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، مشہور یورپی سائنسدان اور فلسفی پروفیسر جوڈ نے اس موضوع پر اپنی کتاب "گائڈ ٹو موڈرن فلوسفی" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس نے بحث کا عنوان ہی یہ رکھا ہے، "طبعیاتی دنیا بحیثیت علاماتی، نہ کہ حقیقت"۔ اسی طرح پروفیسر مولانا عبدالباری ندویؒ نے بھی سائنس کے دوسرے مسلمہ محققین کے نقول پیش کر کے طبعی دنیا ایک علاماتی دنیا کی صورت میں پیش کیا ہے اور پھر حاشیہ پر لکھا ہے علم آدم الاسماء کلھا سے عام طور پر مفسرین جو حقائق اشیار کی تعلیم دیتے ہیں، وہ کہیں ایسی بات تو نہیں ہے جو قرآن کے منشا کے خلاف ہو، آخر خدا نے صرف اسمار کا لفظ کیوں استعمال فرمایا۔" مذہب اور سائنس، ص ۱۵۶

پھر اس آیت کی چند سطروں میں عارفانہ تفسیر بیان فرمائی ہے جس میں زیادہ تر شیخ اکبرؒ کے علوم سے استفادہ فرمایا ہے، ان کی رائے میں قرآن کے علوم مفسرین کی تفسیر تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ عرفا کی تصانیف سے بھی بہت سی گرہیں کھلی ہیں، قرآن میں جہاں احکام اور فقہیات کا ذکر ہے وہاں علامہ کشمیری فقہائے مفسرین کو ترجیح دیتے ہیں، اور عارفانہ یا متکلمانہ تفسیروں کو نہیں چھیڑتے ہیں، بلکہ کل فن رجال پر یقین رکھکر احکام القرآن (جصاص) اور احکام القرآن (ابن العربی المالکی) پر اعتماد کرتے ہیں، ملت صابی کی تحقیق میں حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے تسلیم کرتے ہوئے، امام ابوبکر جصاص کی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔[1]

لم اجد تحقیق الصابئین اتقن مما ذکرہ الجصاص فی احکام القرآن۔[2]

امام فخر الدین رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ امام صاحب "قرآن کی مشکلات میں کھپتا ہے"[3] یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ امام رازی قرآن کی مشکلات اور معضلات میں غوطہ تو مارتے ہیں مگر کہیں کہیں اطمینان نہیں ہوتا ہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ لکھتے ہیں، کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت الاستاذ (علامہ کشمیریؒ) سے عرض کیا کہ امام رازی کی تفسیر کے بارے میں علامہ سیوطی نے اتقان میں جو یہ نقل کیا ہے "فیہ کل شئی الا التفسیر" یعنی اس میں سب کچھ تو ہے مگر تفسیر ہی نہیں ہے، اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، تو جواب دیا کہ یہ ریمارک ایسے شخص کا ہوگا، جس پر روایت پرستی کا غلبہ ہو، اور اخبار و آثار تک محدود رہ کر قرآن کے اسرار و معارف سے غافل ہو گئے[4] ایک اور موقعہ پر اس ریمارک کے

[1] فیض الباری ج ۴، قاموس القرآن مولانا زین العابدین سجاد "لفظ صابی" [2] مشکلات القرآن ص ۱۲ [3] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۴۸-۴۹۔

[4] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۴۸-۴۹

بارے میں یہ بھی فرمایا۔

ذلک القول ظلم فی حق الامام[1]۔

امام صاحب کے حق میں یہ بات ظلم و زیادتی ہے۔

روح المعانی کی قدر و اہمیت کے دل سے معترف ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مجھے صاحب روح المعانی سے دو واسطوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، تفسیر بیضاوی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں علامہ بیضاوی نے اپنی کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے۔

واعلم ان البیضاوی لم یصنف کتابہ علی طور المحدثین، بل اخذ کثیراً من الکشاف یأتی فی کتابہ[2] الفائق بالموضوعات ایضاً۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قاضی بیضاوی اپنی تفسیر محدثین کے طرز پر نہیں لکھی ہے، بلکہ قاضی صاحب نے کشاف سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، اور کشاف کے مصنف اپنی قابل قدر کتاب میں موضوع احادیث بھی لاتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خانؒ کی تفسیر فتح البیان کو علامہ شوکانی کی تفسیر کا دوسرا نام سمجھتے ہیں، ابو محمد عبدالحق حقانی کی مشہور اردو تفسیر کی اہمیت و عظمت کے قائل ہیں، عقیدۃ الاسلام میں اسکے مقدمہ کا حوالہ دیا ہے، بلکہ دوسرے ایڈیشن میں چند سطروں میں اس پر تقریظ بھی لکھی ہے، جو مطبوعہ تفسیر حقانی میں شامل ہے، اردو تراجم میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ موضح القرآن کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ مشکلات القرآن میں بھی کئی غوامض موضح القرآن کی روشنی میں ہی حل کئے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بھی

[1] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۴۸-۴۹ [2] فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۳

تفسیر بیان القرآن کا حوالہ بھی مشکلات القرآن میں دو جگہ ملتا ہے۔

آخر میں ہم علامہ محمد انور شاہؒ کے ارشادات کی روشنی میں قرآن حکیم کی صرف دو آیات کا مفہوم درج کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ علامہ ممدوح مشکل اور اختلافی مسائل کس خوبی کے ساتھ سہل اور قابل قبول بنا دیتے ہیں، اگرچہ ان کے بعض تلامذہ نے کچھ تفسیری افادات اردو زبان میں بھی منتقل کئے ہیں،[1] تاہم اس مضمون کو کسی قدر مکمل کرنے کی غرض سے ہم بھی دو آیتوں کی تفسیر مختصر طور پر درج کریں گے۔

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ — اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں

لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (انعام - ۵۹) — جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

علامہ محمد انور شاہؒ فرماتے ہیں۔

"علوم کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم تکوینیہ (۲) علوم تشریعیہ، تکوینی علوم پر کوئی بھی انسان مکمل طور پر آگاہ نہیں ہے، یہاں تک کہ انبیاءؑ بھی ان سے بے خبر ہیں، اللہ تعالیٰ نے تکوینی علوم کی ساری کنجیاں اپنے قبضے میں رکھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے، چونکہ انبیاءؑ صرف شریعت قائم و نافذ کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے انھیں تکوینی علوم کو چھوڑ کر صرف تشریعی علوم سے آگاہ کرنا ہی مناسب تھا، اور تکوینی علوم کے تمام کے اصول محفوظ رکھے گئے" البتہ ان اصول کے جزئیات میں انبیاءؑ کو کچھ سے باخبر رکھا گیا، بلکہ اولیاء اللہ کو بھی کچھ جزئیات کا علم دیا گیا، اسی مقام پر امام فخر الدین رازی کو اشتباہ

[1] اس سلسلے میں مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی کی قاموس القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ کی ترجمان السنۃ (بحث ختم نبوت) اور پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی وحی الٰہی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

لاحق ہوا، جس کی بنا پر وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکے، اس پر قاضی شوکانی صاحبؒ نے امام رازی کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ رازی کی فلسفیانہ کج روی ہے، کیونکہ بقول قاضی شوکانی کسی بھی انسان کو (چاہے وہ پیغمبر یا ولی ہی کیوں نہ ہو) تکوینی علوم میں کسی جزء کا کوئی علم بھی عطا نہیں کیا جاتا ہے، مگر میں (محمد انور شاہ) کہتا ہوں کہ اس طرح کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے، جو دنیا میں گزرنے والے واقعات سے بے خبر ہو۔[1] اگر علامہ شوکانیؒ نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ جانتے کہ غیب کی خبر دینا ایک فن ہے، علامہ ابن خلدون نے اسے فنون ہی میں شمار کیا ہے،[2] یہ جانی پہچانی بات ہے کہ جب کاہنوں نے کبھی کسی چیز کے واقع ہونے کی خبر دی تو وہ ان کی پیشینگوئی کے مطابق ہو کر رہی، اس لئے یہ امام رازیؒ کی کج روی نہیں، بلکہ خود قاضی شوکانی کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علم غیب کی جزئیات کا علم درحقیقت کوئی علم ہی نہیں ہے، کیونکہ جزئیات ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں، اور ایک جزء کا علم دوسرے جزء کے ساتھ کوئی ربط بھی نہیں رکھتا ہے، اس لئے یہ کوئی علم ہی نہیں ہوا، علم صحیح معنوں میں وہ ہوا جو اس نوع کے سارے افراد پر مشتمل ہو، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یورپ سے ہزاروں مصنوعات ہمارے پاس آتے ہیں، ہم انھیں دیکھتے بھی ہیں، اور جانتے بھی، مگر اس کے باوجود ہم ان کے اصول سے ناواقف ہیں

[1] فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۱ [2] مصر کے نامور فاضل اور ادیب محمد عبد اللہ العنان لکھتے ہیں۔ السحر والسیمیاء واسرار الحروف والکیمیا والانفعال الروحانی والأسرار الخفیۃ والاستدلال علی الضمائر ... ھی جمیعاً عندہ من انواع العلوم ومما یلحق بھا (ابن خلدون، حیاتہ وتراثہ الفکری) ص ۱۱۶، قاھرہ ۱۹۳۹ء

علم صحیح معنوں میں وہ علم ہے کہ جاننے والا اس کے جاننے سے اس نوع کے تمام اصول واجزا اور ان کے حقائق سے مطلع ہو جائے، اللہ نے اس آیت قرآنی میں مَفَاتِحْ کا لفظ استعمال کرکے دراصل اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے جب تمھیں چابی دے دی جائے گی تو تم تمام تالوں کو جب چاہو کھول سکتے ہو، مگر یہ حالت علم کلی ہی کے ساتھ مختص ہے، جو صرف حق تعالےٰ ہی سے مخصوص اور اسی تک محدود ہے، اس نے اپنے بندوں کو حسب استعداد بکھرے ہوئے اجزا عطا کئے ہیں، کلیدی اہمیت و نوعیت کے علوم اسی کے پاس ہیں، یہاں لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ کا حصر بھی بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آجاتا ہے۔[1]

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ	جب خدا نے فرمایا کہ عیسیٰ میں تمھاری
وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ	دنیا میں رہنے کی مدت پوری کرکے
مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا	تم کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور تمھیں
(آل عمران ۵۵)	کافروں صحبت سے پاک کر دوں گا۔

علامہ محمد انور شاہؒ اس آیت کی تفہیم و توضیح میں ان تین الفاظ کی طرف خاص توجہ کرتے ہیں

۱۔ متوفیک ۲۔ رافعک ۳۔ مطہرک

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ عربی میں "وفات" اور "موت" علحدہ علحدہ معنی کیلئے آتے ہیں، اگر موت اور وفات دو مرادف الفاظ ہوتے تو ائمہ لغت نے اس کی تصریح کی ہوتی، بلکہ اس کے عین برعکس علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ وفات کے معنی ہرگز حقیقی اور طبعی موت نہیں ہے، چنانچہ ازہری نے تہذیب الالفاظ اور ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں وفات کو موت کے

[1] فیض الباری ج ا ص ۱۵۱ (مع حاشیہ)

منی میں نہیں لیا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ اہل عرب وفات کے موت کے معنی میں استعمال سے ناواقف تھے، اسی وجہ سے ابن سیدہ نے مخصص میں جب اس لفظ کو موت کے معنی میں بطور کنایہ استعمال کیا تو اشعار عرب کے بدلے قرآنی آیت ہی سے استشہاد کیا۔

لفظ التوفي، اتفقت نظائرُ	توفی لفظ کے اشتقاق کی مثالیں اس پر
اشتقاقہم في انہ استیفاء	متفق ہیں کہ اس کے معنی حق کی مکمل
الحق بحیث لم یترك	وصولیابی ہے۔ اس طرح کہ حق سے
منہ شیئا۔	کوئی چیز باقی نہ رہے۔

علامہ ممدوحؒ آگے لکھتے ہیں کہ یہ لفظ موت کے معنی میں آگے اس وجہ سے استعمال ہونے لگا کہ توفیؔ میں تعظیم و تشریف ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کا معنی موضوع لہٗ ہی ختم ہو جائے، قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ چنا ہوا ہے، اور اس کے ایک ایک حرف کے پیچھے حقائق موجود ہوتے ہیں، مزید برآں موت اور وفات کا فرق بلغاء نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، اور ہر وقت اس کی رعایت رکھی ہے، چنانچہ ابو البقانے کلیات میں لکھا ہے۔

قال (ابو البقاء) التوفي	توفی کا لفظ عام لوگوں کے ہاں موت
الاماتة وقبض الروح	دینے اور جان لینے کے معنی میں استعمال
وعلیه استعمال العامة	ہوتا ہے، مگر بلغاء کے ہاں اس کے معنی
أو الاستیفاء واخذ الحق	پورا پورا لینا اور حق وصول کرنا ہے۔
وعلیه استعمال البلغاء[1]	

[1] عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: علامہ محمد انور شاہ کشمیری، ص ۱۱

اس کے بعد علامہ کشمیری نے ابن اثیر کی المثل السائر اور علامہ سیوطی کی اِتقان سے بلاغت کے کچھ اہم اصول و قواعد کی روشنی میں وفات اور موت کا فرق واضح کیا، پھر لکھتے ہیں۔

فاذا تقنت هذا، فالتوفی کسائر نظائره فی المادة للأخذ والتناول کوفاء العدة والدین اللازم و الأجل للمضروب ولا دلالة لهٔ علی الموت من حیث اللفظ واستعماله نعم یجامعهٔ کثیراً لان استیفاء العمر یعقبهٔ الموت وهذا امرٌ آخر.... انما شاع الآن فی الموت کنایةً[1]

جب تمہیں اس تحقیق پر اطمینان ہو اتو جان لینا چاہئے کہ وفات اپنے ماخذ کے تمام امثال و نظائر کی طرح "لینے اور پانے" کے معنی رکھتا ہے، جیسے وفائے عدت یا ادائے قرض کی پوری وصولی، یا مقررہ مدت کی تکمیل وغیرہ، اس لئے لفظ اور اس کے استعمال کی حیثیت سے یہ لفظ قطعاً موت کا معنی نہیں رکھتا ہے، ہاں موت کے معنیٰ سے اکثر یہ ملتا ہے، کیونکہ عمر کی رسیدگی کے بعد موت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ دوسری بات ہے۔ .... اب یہ لفظ (وفات) موت کے

وفات کے ایک اور معنوی خوبی بیان کرتے ہوئے علامہ کشمیری لکھتے ہیں۔

المتوفّٰی یکون حق المتوفی. فلا یقال مثلاً اِذا اخذ الفرس من الصحراء توفیت الفرس وانما یقال توفیت حقی ای حصلته ویقال فی معناه بالفارسیة "وصول کردم حق خویش را" واذا کان لتحصیل حقه والحق لا یکون عند الغیر الا عاریة لمدة مضروبة[1]

متوفّٰی حق ہوتا ہے متوفی کا مثلاً میدان میں گھوڑے کو پکڑ کر یہ نہیں کہہ سکتے ہیں "توفیتُ الفرس" بلکہ ہم یہ کہیں گے "توفیتُ حقی" یعنی میں نے اپنے حق کو پالیا فارسی میں ہم اس معنی کو یوں ادا کر سکتے ہیں، "وصول کردم حق خویش را" یعنی یہ لفظ اس حق کے حاصل کرنے کے وقت بول سکتے ہیں جو وہ دوسرے کے پاس ایک مقررہ مدت کے لئے عاریۃً ہو۔

علامہ ممدوح کے نزدیک موت اور وفات حقیقی اور وضعی اعتبار سے دو مختلف معانی کے حامل ہیں، قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے جہاں وفات کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اس کے حقیقی اور وضعی معنیٰ ہی مقصود ہے، نہ کہ کنایہ۔ اس سلسلے میں علامہ کشمیری یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کی معجزانہ بلاغت آنکھیں کھول دیتی ہے، غور کی بات ہے کہ قرآن نے حضرتِ عیسیٰؑ کے لیے وفات ہی کا لفظ استعمال کیا، جس سے ان کے رفع و نزول کی مکمل تائید و توثیق ہوتی ہے، ہاں ایک آیت ایسی بھی ہے، جہاں موت ہی کا لفظ وارد ہوا ہے اور علامہ ممدوح اذعان و اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہاں موت کا لفظ لانا ہی لازمی تھا، کیونکہ اس آیت کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی حیات بعدِ نزول سے ہے جب وہ اصلاح و تجدید کریں گے اور پھر عام طبعی موت پائیں گے۔ آیت یہ ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ الآیۃ

اور کوئی اہل کتاب نہیں ہوگا مگر ان کی

[1] عقیدۃ الاسلام۔ ص ۴۵۔

[1] تحیۃ الاسلام۔ ص ۲۳، مجلس علمی ڈابھیل۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ	موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ	اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ
شَهِيْدًا (نساء - ۱۵۹)	ہوں گے ۔

اس آیت میں موتہٖ میں ہٖ حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع ہے یعنی قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا تو اپنی طبعی موت پانے سے پہلے پہلے تمام اہلِ کتاب ان پر ایمان لائیں گے، تو صاف معلوم ہوا کہ قرآن موت کا لفظ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے اس دور کے ذکر میں لایا ہے، جو نزول کے بعد ہوگا ۔

بعض مفسرین نے موتہٖ میں ہٖ کا مرجع اہل کتاب ٹھہرایا ہے، مگر علامہ کشمیریؒ نے احادیث سے ثابت کیا ہے کہ کبار صحابہؓ نے بھی یہاں حضرتِ عیسیٰؑ کی ذات مقدسہ مراد لی ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں اسی کو مسلک جمہور کہا ہے،

مطہرک :۔ آیت میں یہ الفاظ درج ہیں ومُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اے عیسیٰؑ ہم کفار کے ہاتھوں سے تم کو بالکل پاک وصاف رکھیں گے، اس قرآنی تصریح کے بعد جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا، یہاں ان کے جسم کو مارا گیا، اور وہ بے ہوش ہوئے، لوگ سمجھے کہ وہ انتقال کر گئے، تو انھیں تختۂ دار سے اتار کر دفن کیا، مگر آپ درحقیقت زندہ تھے، چند دن بعد افاقہ ہوا اور کچھ ہمدردوں نے آپ کو قبر سے نکالا، علاج ومعالجہ کے بعد آپ روپوشی کی حالت میں مادرِ وطن سے بھاگ گئے؛ یہ تاویلاتِ باردہ اس سے کہیں زیادہ مستبعد ہیں، جو ممات مسیح کے قائلین کو عقیدۂ رفع ونزول میں محسوس ہوتی ہے، علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ اگر ان رکیک باتوں پر

غور کیا جائے تو اس اولوالعزم پیغمبر کی طہارت وتطہیر، جس کا قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، بالکل بے معنیٰ ہوتا ہے، صحیح بخاری میں وارد ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے ارضِ مقدس ہی میں آخری آرام گاہ نصیب کرنے کی دعا کی تھی اسی طرح دوسرے انبیاءؑ بھی پاک مقامات ہی کی تمنا کرتے تھے، یہاں خود اللہ تعالےٰ حضرتِ عیسیٰؑ علیہ السلام کو بشارت دیتا ہے کہ میں تم کو کفار سے محفوظ رکھوں گا، ان صاف وصریح الفاظ کے بعد دعویٰ کرنے والوں کا یہ دعویٰ کتنا کھوکھلا اور خلافِ قرآن نظر آتا ہے، جو کشمیر میں قبر مسیح کا دعویٰ کرتے ہیں، مرزائے قادیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ محمد انور شاہؒ فرماتے ہیں ۔

وعواه ان عیسیٰ علیہ السلام	وہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے
توفی بکشمیر وقد کانت	کشمیر میں وفات پائی، حالانکہ کشمیر
دار کفر ووثنیۃ اذذاک	اس زمانے میں کفر اور بت پرستی کا
وکان اللہ قال لہ ومطہرک	گھر تھا، ادھر خدا نے ان سے وعدہ
من الذین کفروا، وقد	کیا تھا، کہ میں تجھے کفار سے پاک اور
جاء اذا لم تستحی فاصنع	محفوظ رکھوں گا۔ سچ ہے، ع
ماشئت۔ ۱	بے حیا باش ہرچہ خواہی کن ۔

غرض تطہیر کے لیے یہ لازم تھا کہ کفار اور بدباطن لوگوں سے آپ کو محفوظ رکھا جائے اور "رفع" اس کا اہم جزء تھا ۔

"رفع" :۔ اس آیت کا تیسرا قابلِ تحقیق لفظ "رفع" ہے، جو لوگ حضرتِ عیسیٰؑ کی ممات کے قائل ہیں، وہ یہاں رفع سے رفعِ درجات مراد لیتے ہیں نہ کہ جسمانی رفع، ان کے جواب میں

---

۱ عقیدۃ الاسلام ص ۲۳

محدث کشمیری فرماتے ہیں۔

اولاً۔ ہر ایسے شخص پر وہ جو قرآن و حدیث پر ایمان رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ امتِ محمدیہ باطل پر کبھی بھی اکٹھا نہیں ہوسکتی ہے، واجب ہے کہ وہ یہاں جسمانی رفع ہی تسلیم کرے، اسی پر قرآن قطعی الثبوت اور اجماعِ امت قطعی لدلالہ ہے۔[1]

ثانیاً۔ حضرت عیسیٰؑ کا یہ رفع ان کے لئے اسی طرح بمنزلہ معراج تھا، جس طرح دوسرے انبیا علیہم السلام اس عطیۂ خداوندی سے سرفراز ہوئے، امام راغب اصفہانی نے مفرداتُ القرآن میں یہی مراد لیا ہے، جیسا کہ تفسیر البحر المحیط میں ان سے منقول ہے۔

ثالثاً۔ سورہ نساء کی رفع و نزولِ مسیحؑ سے متعلق آیات وفدِ نجران کے سامنے تلاوت کی گئی، جیسا کہ ائمہ متقدمین نے متفقہ طور پر نقل کیا ہے کہ یہ ان کے عقیدہ کی اصلاح کے لیے نازل ہوئیں، ان کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰؑ روح و جسد کے ساتھ اٹھائے گئے، اگر اسلام کا عقیدہ اور قرآن کی تعلیم اس کے برخلاف ہوتی تو ضرور تھا کہ نظمِ قرآن میں ایسا لفظ لایا جاتا جو نصاریٰ کی تکذیب کرتا، اس کے برخلاف قرآن نے ان کے عقیدۂ رفع سے اتفاق و تائید کرکے صرف قتل، صلیب اور کفارہ کا ابطال کیا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ جن اکابر علمائے نصاریٰ نے اسلام قبول کیا ان سے بھی منقولات کی کتابوں میں ایسے بہت سے آثار منقول ہیں

---

[1] مماتِ مسیح کے بعض قائلین نے اپنی رائے امام مالکؒ، امام فخر الدین رازیؒ، علامہ ابن حزم اندلسیؒ، امام ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیم اور معتزلہ کی طرف بھی منسوب کی تھی، علامہ محمد انور شاہ نے یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ثابت کیا، اور ان تمام اکابر کی تصانیف سے نقول پیش کرکے دعویٰ کرنے والوں کی علمی خیانت نمایاں کردی، اس سلسلے میں علامہ کشمیریؒ کا ایک دوسرا تحقیقی رسالہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح بھی قابلِ مطالعہ ہے جس کے بارے میں علامہ محمد زاہد الکوثری لکھتے ہیں، للمولانا المحدث الکشمیری کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح یسوق فیہ

جو حضرتِ عیسیٰؑ کے رفعِ جسمانی پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً عبداللہ بن سلامؓ، کعب الاحبارؓ، وہب بن منبہؒ وغیرہ، ان کے یہ آثار درِ منثور اور جامع ترمذی میں محفوظ و مندرج ہیں۔

رابعاً۔ مماتِ مسیحؑ کے قائلین رفع سے رفعِ روح مراد لیتے ہیں، یعنی روح ہی کو خدا نے مقعدِ صدق کی طرف اٹھایا، اور بلند مقام عطا کیا، علامہ محمد انور شاہ فرماتے ہیں کہ یہود در اصل حضرت عیسیٰؑ کو جسمانی اذیت پہنچانے اور قتل کرنے کے درپے تھے، قرآن بھی اسی جسمانی اذیت اور قتل یا صلیب جسد کی نفی کرتا ہے، روح یہاں داخل کرنا بے معنیٰ ہے۔ اسی طرح رفعِ جسد کی نفی کرکے رفعِ درجات پر زور دینا بھی نظمِ قرآن کے خلاف ہے، یہاں رفع خاص نوعیت و اہمیت کا حامل ہے، رفعِ درجات کو حضرتِ عیسیٰؑ کے ساتھ خاص کرنا بے معنیٰ ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۶) سبعون حدیثاً تدل علیٰ نزولہ علیہ السلام (مقالاتُ الکوثری، مطبوعہ مصر، ص ۳۵۵) یعنی مولانا محدث کشمیریؒ نے التصریح بما تواتر فی نزول المسیح کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایسی ستر احادیث پیش کی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے نزول پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی طرح یہ رسالہ جب علامہ کوثری کے توسط سے جلیل القدر فلسفی عالم علامہ مصطفیٰ صبری کو پہنچا تو انھوں نے بھی تعجب کے ساتھ لکھا۔ سبعون حدیثاً مرویاً عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم بالسند رواۃ مختلفین من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم لابُدَّ ان تکون لھا قیمتھا۔ موقف العقل والعلم والعالم (ج ۴ ص ۲۱ احیاء الکتب العربیہ ۱۹۵۰ء) یعنی رسول اللہؐ سے ستر احادیث کا صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی زبانوں سے مروی ہونا یقیناً قدر و اہمیت کا حامل ہے، التصریح کا دوسرا ایڈیشن دمشق سے طبع ہوا ہے۔ عبدالفتاح ابو غدہ نے اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔

کیونکہ قرآنِ حکیم کی تصریح کے مطابق رفعِ درجات عارفین اور مومنین پر بھی مشتمل اور محیط ہے قرآن کہتا ہے :-

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ لا	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں
وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ	"اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ
دَرَجٰتٍ ط (مجادلہ = ۱۱)	ان کے درجے بلند کرے گا۔

اس آیت میں تمام مقربین داخل ہیں۔ اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ رفع بمعنی رفع درجات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے درجات ہر حال میں بلند اور ارفع ہیں، غرض یہ رفع غیر معمولی اہمیت اور نوعیت کا حامل ہے[1]

---

[1] عقیدۃ الاسلام (ص ۵۰ تا ۷۵) علامہ کشمیریؒ نے اس تصنیف اور اس کے حاشیہ (تحیۃ الاسلام) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق آیات کی ایسی فاضلانہ تشریح و تفسیر کی ہے، جو مطالعہ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ نقل ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے تلامذہ کو اس تصنیف کا مطالعہ کرنے کی ہدایت فرماتے تھے، جن میں مولانا محمد ادریس ندوی نگرامی صاحب شامل تھے، (خطوطِ انور) مولانا احمد رضا صاحب بجنوری حصہ اوّل صفحہ ۱۶، نیز ملاحظہ ہو معارف سلیمان نمبر (۱۹۵۵ء) صفحہ ۲۲۰، ۲۲۰-۲۲۴)

تفسیر ابی مسلم الاصفہانی (عربی)

ابومسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال تفسیر کی دوسری کتابوں میں منتشر تھے انکو مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

اسلام اور مستشرقین کی بیرونی ڈاک

پیرس ۲۶ رجمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم و محترم زاد مجدکم :- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں نوازش نامہ ملا، اور سرفراز کیا، جالیس پینتالیس سال ہو گئے، آپ سے دارالمصنفین میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، اور آپ کی نوازش اور مہمان نوازی بھولی نہیں، تب کی ملنساری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر وقت کی ہے، حفظکم اللہ

دعا فاکم،

آپ کی فرمایش سر آنکھوں پر، لیکن مستشرقین کی شکایت کے ادارے سے اس ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں، اگر محترم علی میاں نے مجھ سے اس پر پیشگی گفتگو کی ہوتی تو میں ادب سے عرض کرتا کہ ایسا نہ کریں ! ان میں سے ہر فرد پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا، اور جو لگا و لگاؤ رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی کرنے لگتا ہے، (جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آ رہا ہے)

ہم اپنے بچوں کو انہی کے ہاں بھیجتے ہیں، اور اُن کے پرزہ کاغذ (ڈاکٹری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں ؟ اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتے، وہ مسلمان نہیں ہیں، اُن سے توقع کرنا کہ وہ سو فی صد ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے، اُن کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں، اور

تنقیدیں نہیں کرتے ؟

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ "مخلص" ہوتے ہیں یعنی اپنے علم اور اپنی فہم کے مطابق تاثر لیتے اور بتاتے ہیں، اور گالی گلوچ کے ساتھ نہیں، خالص علمی انداز میں ان کو ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں ایک تجربہ عرض کرتا ہوں، شاخت آنجہانی سے آپ ناواقف نہیں، ایک مرتبہ انقرہ میں امام سرخسی کا جشن منایا گیا، پہلے شاخت صاحب کی تقریر تھی، پھر میری باری آئی، انھوں نے اپنی رائے بیان کی، اس سے پیشگی واقف ہوئے بغیر میں نے ان چیزوں کی تردید کی، جشن کے صدر نے بعد میں مجھ کو بیان کیا کہ شاخت نے اپنی پڑھی ہوئی تقریر واپس مانگ لی، اور بہت سی ترمیموں کے بعد دی، کہ آپ اسے چھاپ سکتے ہیں، یہی تجربہ مجھے اٹلی کے سب سے بڑے مستشرق "لیوی دلا ویدا" سے رہا۔ جزیہ اور ذمیوں سے دگنی جنگی کی وجہ سے میری بحث پڑھ کر مجھے خط لکھا کہ تمھاری ان دلیلوں پر تو کوئی یہودی ربی بھی زبان نہیں کھول سکے گا،

غرض اس ناچیز کی رائے میں ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر، زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دور ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محنت چاہتی ہے تو زیادہ صحیح اور زیادہ مفید ہوگا،

معارف میں خطبات بھاولپور کی تحلیل دیکھی، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی، معلوم نہیں اس کا ۲۲ صفحوں کا غلط نامہ آپ کو ملا یا نہیں کئی دفعہ کا فردوں کو بھی "حضرت ..... رضی اللہ عنہ لکھ ڈالا ہے"

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں، حال میں سلمان صاحب یہاں آئے تھے، دعوت دی ہے، شاید آیندہ ماہ ڈربن جا کر دوبارہ ملاقات کر سکوں،

نیاز مند

حمید اللہ

فرانس

۲۲ر۳ر۸۳ ۱۹ء مکرمی و محترمی ! السلام علیکم

آپ کو فرانس کے ڈاکٹر (سرجن) موریس بوکائی (Maurice BacaIlIE) کی کتاب "he Bible,the en and Science" کا یقیناً علم ہوگا، اور اس کا انگریزی ترجمہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، ڈاکٹر بوکائی نے بھی اپنی اس بے نظیر کتاب میں اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، اس کتاب کو نہ محمدؐ کی کتاب کہنا چاہئے اور نہ اسلام کو محمدؐ کا دین، ساتھ یہ بھی کہ یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو محمڈنز (mohammadans) اور اسلام کو محمڈنزم کہنا شروع کر دیا اور حیرت ہے کہ مسلمان بھی اس فریب میں آ گئے لیکن ہمارے یہاں اب بھی پڑھے لکھے مسلمان موجود ہیں، (جیسا کہ آپکے سیمینار سے معلوم ہوا) جو اس قابل نفرت اور غلط اصطلاح کے استعمال کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے متعلق ع :-

بریں عقل و دانش بباید گریست

کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے ؟

پچھلے ہفتہ حکیم محمد سعید صاحب چار دن کے لئے پیرس یونیسکو کی ایک میٹنگ میں شمولیت کے لئے تشریف لائے تھے، آپ کا اور معارف کا ذکر خیر بھی آیا،

والسلام

نیاز مند طفیل محمد

طہران ۱۵ر اپریل

مکرمی، سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا، آپ کے متعدد نوازش نامے موصول ہوئے اور کہن جنا

ایک ہی کا دے سکے، ایک طویل خط ادھورا لکھا پڑا ہے، تکمیل کے لئے فرصت کی تلاش ابھی تک ہے، معافی کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں، سیمینار کے موقع پر آپ نے وہی کرم اور وہی شفقت برتی، جو میرے والد یا میرے خسر صاحب برتتے ہیں: آپ کے گھر میں ہم دونوں رہے، اور گھر کی طرح بے تکلفی رہی، آپ کے اخلاص کا گہرا اثر لے کر وہاں سے روانہ ہوئے، وہ نقش اب تک اسی طرح تازہ ہے؛

آپ کے خطوط کے موصول ہونے کے بعد، یوسف قرضاوی صاحب سے برابر رابطہ قائم رکھا، تاکہ سیمینار کے آگے بڑھانے کی کوئی سبیل ہو سکے، بہت امید ہے، لیکن آج کل پٹرول کی دولت میں اچانک جو کمی واقع ہوئی، اس سے ذمہ داروں کے حوصلے کچھ سرد پڑ گئے ہیں، یوسف قرضاوی صاحب کا یہ تاثر ہے یہی تاثر میرا بھی ہے، اس سیمینار کو جوش بڑھانے کی سعی سے پرہیز کرنا چاہیے، اس کا معیار خالص علمی، اور بہت بلند ہو، اور میرا اور قرضاوی صاحب کا خیال ہے کہ اگلی کانفرنس کی تیاری اچھی طرح سے ہو، اور صرف معیاری مقالات ہی پڑھے جائیں، اسکے لئے ضروری ہے کہ سیمینار کے انعقاد سے بہت پہلے مقالات کی ایک کمیٹی جائزہ لے کر رد و قبول کا فیصلہ کرے، میری تجویز ہے اور اس سے قرضاوی صاحب نے اتفاق کیا کہ کانفرنس کا ایک موضوع پہلے سے طے کر دیا جائے اور اس کے لئے علیحدہ علیحدہ عنوانات بھی بتا دیئے جائیں، اسی دائرے میں لوگ مقالات لکھیں، میری تجویز ہے کہ اگلے سیمینار کا موضوع "مستشرقین اور قرآن پاک" ہو، اگر آپ چاہیں تو میں دوسرے افراد سے مل کر اس کے علاحدہ علاحدہ عنوانات مرتب کرلوں، سیمینار کمیٹی بہت لمبی چوڑی بنا لی گئی ہے، ورنہ اس کا امکان تھا کہ ملاقات کی سبیل نکالی جاتی،

والسلام

ظفر اسحاق انصاری

پٹرولیم یونیورسٹی ظہران"

مطبوعات جدیدہ

اقبال اور تصوف: مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۵۵، قیمت ۱۳ روپیے پتہ (۱) اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، (۲) مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے افکار اور دلچسپی کے موضوعات پر بحث، مطالعہ اور تحقیق کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی، اور ان پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو اکتوبر ۱۹۷۷ء میں "اقبال اور تصوف" کے موضوع پر ہونے والے سمینار میں پڑھے گئے تھے، اس میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے فضلاء کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر عالم خوندمیری (حیدرآباد) جناب میکش اکبر آبادی اور ڈاکٹر فصیح احمد کمالی علی گڑھ کے مقالات بھی ہیں، اکثر مضامین اقبال اور تصوف کے موضوع پر ہیں اور ان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال حقیقی تصوف کے خلاف نہ تھے، اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا مضمون خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، ان کے نزدیک اقبال کا سارا کلام تصوف ہے، مگر انھیں اس کا مخالف اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تصوف پر تنقید کی ہے، اور اسے مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار قرار دیا ہے، اس تضاد کو دور کرنے کے لئے مولانا نے تصوف کا اصل مقصد اور اس کی مختصر تاریخ بیان کر کے دکھایا ہے کہ اس کا سارا تار و پود کتاب و سنت سے تیار کیا گیا ہے، مگر بعد میں اس پر اشراقیت، مرشدکیت، رہبانیت اور ویدانت کے اثرات پڑے، جس سے اس کی روح اور اصلی خصوصیات

ختم ہوگئیں، اور وہ عرس، قوالی، بدعات، تعطل اور فرائض و واجبات سے گریز کا نام رہ گیا ہے، اقبال اس رسمی تصوف کے اسی طرح خلاف تھے جس طرح یہ بھی اسلام کے خلاف تھے، اس کے مقابلہ میں وہ اس اصلی تصوف کے منکر تو کجا ہمیشہ داعی رہے جس کی حقیقت تزکیۂ نفس، اخلاص فی العمل، فقر، درویشی اور اقبال کے مردِ مومن کے وہ اوصاف ہیں جو قرآن نے محسنین کے بیان کیے ہیں، اس کے ثبوت کے لیے مولانا نے مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کا خلاصہ پیش کیا ہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے فاضلانہ مقالہ میں ایک دلچسپ نکتہ کی بات یہ کہی گئی ہے، کہ اقبال کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے لبریز ہے، اور ان کا فلسفہ تصوف کے کیف میں ڈوبا ہوا ہے، رومی، عطار اور سنائی کے مطالعہ نے ان کے دل میں تصوف کا ایک نکھرا ہوا ذوق پیدا کر دیا، انھوں نے تصوف میں سے زندہ و پایندہ عناصر چن کر اسلام کو واپس لوٹائے، اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں ایک واضح لکیر کھینچی، آزاد صاحب نے بھی اسرارِ خودی کے مضامین کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ اسلامی و عجمی تصوف کیا ہے، اور اقبال کس کے موافق اور کس کے مخالف تھے، میکش اکبرآبادی اور رشید نازکی کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں، اول الذکر نے اس پر زور دیا ہے کہ شروع میں اقبال وحدۃ الوجود کے مخالف تھے، مگر آخر میں اس کے قائل ہو گئے تھے، یہی خیال جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے، اور دونوں نے اسے مدلل طور پر ثابت کیا ہے، مگر نازکی صاحب کے خیال میں وہ آخر آخر تک اس کے مخالف اور وحدۃ الشہود کے قائل تھے، لیکن شاہ ولی اللہ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا جائے کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان محض نزاع لفظی اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں تو پھر اس قسم کی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نازکی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عربی کے وجودی مسلک کا سلسلہ باطنیت تک پہنچتا ہے، ان کے اس نظریہ اور

ولایت کی نبوت پر برتری، قدمِ ارواح اور حلول وغیرہ پر اقبال کو سخت اعتراض تھا مگر وہ ابن عربی کے صوفیانہ مقام کے منکر نہیں تھے، البتہ ان کے فلسفیانہ اندازِ فکر کے سخت نکتہ چیں تھے، ابن عربی کی طرح غالب، حافظ اور رومی سے اقبال کے تعلق و اختلاف پر بھی مضامین درج ہیں، پروفیسر بی این پشپ کے مضمون "طریقِ خانقاہی اور اقبال" میں تصوف پر اقبال کی بعض سخت رائیں نقل کر کے ان کے خانقاہی نظام کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نمایاں کرنے کا ذکر ہے، مگر یہ اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ اقبال تصوف کی انسان دوستی اور عالی قدروں کے قائل تھے، فاضل مرتب کے مقالہ کا دلکش طرز و اسلوب بھی اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، اس میں تصوف کے اس فیضان کا ذکر ہے جو انسان دوستی، اخلاقی بلندی، قلبی طہارت، خدمتِ خلق، رواداری، وسیع المشربی، زہد، توکل اور استغنا کی صورت میں اردو شاعری پر ہوا، اس ضمن میں اقبال کا تذکرہ بھی ہے، جس میں عجمی تصوف کی نکتہ چینی کی بنا پر اقبال کو تصوف کا مخالف قرار دینے کی تردید کی ہے، مولانا روم اقبال کے روحانی مرشد ضرور تھے، مگر اس کی وجہ سے ان کی شاعری کو تمامتر مولانا کی صدائے بازگشت نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ مفتی جلال الدین کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے، عالم خوندمیری اور رحمان راہی کے بعض خیالات بھی محلِ بحث ہیں، ان کے مضامین میں قدرے ژولیدہ بیانی بھی ہے، یہ مجموعہ اقبال کے شیدائیوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مقامِ صحابہ کتاب و سنت کی روشنی میں اور مولانا مودودی } مرتبہ، مولوی محمد ابوبکر صاحب غازیپوری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۵۶، قیمت۔ پندرہ روپیے، پتہ مکتبہ اثریہ، قاسمی منزل، سید واڑہ، غازیپور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں،

اس کتاب میں مصنف کے بقول، پہلے صحابۂ کرام کی وہ تصویر پیش کی گئی ہے، جو کتاب و سنت اور سلف کے ارشادات سے نمایاں ہوتی ہے، پھر وہ تصویر پیش کی گئی ہے، جو مولانا مودودی کی تحریروں سے سامنے آتی ہے، اس سلسلہ میں صحابہ کی تعریف، ان کے جنتی، عادل اور معیار حق ہونے کی وضاحت بیس آیتوں اور حدیثوں سے کی گئی ہے، پھر مولانا مودودی کے موقف کو پیش کر کے لکھا ہے کہ پہلے بھی صحابۂ کرام پر سب و شتم کرنے والے اشخاص اور فرقے موجود تھے جو مولانا کے پیش رو ہیں، آخر میں ان تین صحابہ کے حالات و مناقب درج ہیں، جن کو مصنف کے خیال میں مولانا مودودی نے خاص طور پر مجروح کیا ہے، یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ مولانا کے موقف سے قطع نظر اس نوعیت کی اکثر کتابوں میں صحابۂ کرام کی عظمت، فضیلت اور عدالت کو ان کی عصمت میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے، اس خلط مبحث سے یہ کتاب بھی خالی نہیں ہے، اس کے علاوہ اس کے بعض مندرجات اور آیتوں سے اخذ کردہ نتائج بھی محل نظر ہیں، صحابۂ کرام کے معیار حق ہونے اور اس کے ضمن میں تفسیر بالرائے وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تشفی بخش نہیں ہے، اس پر لکھنے کے لیے مزید مطالعہ اور وسعت نظر کی ضرورت ہے، کتاب میں بعض مباحث کا تکرار اور کہیں کہیں زبان و بیان کی ناہمواری بھی ہے، نوجوان مصنف کو لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق ہے، اگر اس قسم کے پامال اور نزاعی مسائل کے بجائے سنجیدہ اور مفید علمی موضوعات کا انتخاب کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار — مرتبہ، مولانا سید ابوالحسن ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸، قیمت تین روپے

پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

یہ رسالہ رابطہ عالم اسلامی مکہ کے توسیعی خطبات کی ایک کڑی ہے جسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نے اس کی دعوت پر ۸۰ء میں لکھا تھا، اس میں حدیث کی حجیت، ضرورت اور اہمیت پر مختصر انداز سے بحث و گفتگو کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی ذوق و ذہن اور مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت ممکن نہیں ہے، اس سلسلہ میں بعثت محمدیؐ کے مقاصد چہارگانہ تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس کی تشریح کر کے اسلامی معاشرہ اور امت کی تشکیل میں احادیث کا کردار واضح کیا گیا ہے، فاضل مصنف نے احادیث سے انحراف کو دین اور اس کے مزاج و خصوصیات سے محرومی اور عظیم خسارہ بتایا ہے، اور ان کے نزدیک دنیا کے عام مذاہب کے مفلوج ہو جانے اور ان کی خصوصیات باقی نہ رہنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پیغمبروں کے حالات زندگی اور ایمان آفریں کلام کے مجموعے محفوظ نہیں رہے، اور انھوں نے بزرگوں کی حکایات و ملفوظات سے اس کمی کو پورا کرنا چاہا جس کے نتیجہ میں وہ بدعات و خرافات کا مجموعہ بن گئے، مولانا نے امت کے مجددین و مصلحین کی تحریکوں میں بھی احادیث کا نمایاں حصہ بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے ذریعہ انھوں نے اصلاح و تجدید کا کام انجام دیا، اور بدعات و جاہلیت کا مقابلہ کیا، وہ فرماتے ہیں کہ حدیث ہی کی بدولت عہد نبویؐ و عہد صحابہ کا معاشرہ و ماحول محفوظ رہا اور اس کی خصوصیات نسلاً بعد نسل امت میں منتقل ہوئیں اور جب اس سے تعلق کمزور ہوا تو بدعتوں کا دور دورہ ہوا، آخر میں انکار حدیث کے نئے محرکات کی نشاندہی کی ہے اور اس ضمن میں یہ قیمتی بات تحریر کی ہے کہ مغربی تہذیب و طرز زندگی اور سنت نبویؐ سے میل نہیں ہو سکتا، یہ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود انکار حدیث کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں میں ایک بہت مفید اور نمایاں اضافہ ہے، اس کے جو حصے مصنف نے عربی میں لکھے تھے انکے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کی سعادت مولوی سید سلمان ندوی کے حصہ میں آئی، ہونہار مترجم نے فاضل مصنف کی عبارت کی سلاست اور شگفتگی کو حتی الوسع قائم رکھا ہے۔

علم حدیث اور چند اہم محدثین — ا۔ مرتبہ، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت ۱۵ روپے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ہمارے مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے فرزند اکبر ہیں، درس و تدریس کے علاوہ ان کو تحریر و تصنیف کا بھی اچھا ذوق ہے، "ہندوستانی مفسرین اور ان کی اہم تفسیریں" کے عنوان سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کا جو مقالہ لکھا تھا، وہ کئی برس قبل کتابی صورت میں چھپ چکا ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے پہلے حدیث کی جمع و تدوین پر بحث کی ہے، اس سلسلہ میں عہد نبوی اور پھر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اسلام کے دور میں احادیث کے جمع و تحفظ کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، پھر حدیث کے اصول، مصطلحات اور اقسام کے علاوہ جرح و تعدیل اور روایت و درایت کی اہمیت واضح کی ہے، اور رواۃ کے ضروری اوصاف و شرائط بھی قلمبند کئے ہیں، اور علوم حدیث اور اسماء الرجال کی اہم کتابوں کی فہرست بھی دی ہے، آخر میں ائمہ اربعہ اور صحاح ستہ کے مصنفین کے واقعات و حالات اور علم حدیث میں ان کے کارنامے بیان کئے ہیں، یہ کتاب سلیقہ اور محنت سے مرتب کی گئی ہے، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کیلئے خصوصیت سے مفید ہے، اسکی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ نہ زیادہ مختصر ہے، اور نہ بہت طویل، امام مالک کے متعلق لکھتے ہیں "امام مالک کبار تابعین میں سے ہیں... حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا" یہ سہو قلم ہے، دراصل امام مالک کے بجائے انکے دادا مالک بن ابی عامر کبار تابعین میں تھے اور انھوں نے مذکورۂ بالا صحابہ سے کسب فیض کیا تھا

اقلیم ادب کے تاجدار: مرتبہ، جناب مبشر علی صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۰، قیمت دس روپیہ، پتہ، سلیم مبشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھہ، بدایوں،

جناب مبشر علی صدیقی کی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کا ان صفحات میں کئی بار ذکر آچکا ہے، سلیم مبشر اردو میڈیم ماڈل اسکول انکا بڑا کارنامہ ہے جسکے لئے انکی حیثیت خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کی ہے، وہ ایک اچھے اہل قلم اور مصنف بھی ہیں، ادھر چند برسوں میں انکی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں، یہ نئی کتاب ایک درجن

مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں اردو شعر و ادب کی ممتاز شخصیتوں کے بارہ میں اظہار خیال کیا گیا ہے، پہلے مضمون میں مرزا غالب کی قدر و قیمت، اور مختلف حیثیتوں سے انکی اہمیت بیان کی گئی ہے، دوسرے میں سرسید کے طرز تحریر کی خصوصیات کا ذکر ہے، ان دونوں مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کو سادگی، اصلیت اور حقیقت پسندی سے قریب کرنے میں غالب اور سرسید کا کس قدر حصہ تھا، غالب سے متعلق ایک اور مضمون میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہونے والے انکے دیوان کے چھ ایڈیشنوں کی خصوصیات بتائی ہیں، ایک مضمون میں حالی کو اردو کا پہلا سوانح نگار بتا کر حیات جاوید کی اہمیت واضح کی ہے، ایک اور مضمون میں نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار قرار دیا ہے، اور انکی ناول نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، مولانا شبلی کے اہم مقالات کا تعارف اچھے انداز میں کرایا ہے، مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور مولوی عبد الحلیم شرر کے ادبی و تحریری کارناموں کا تذکرہ بھی کیا ہے، ایک مضمون میں اردو کے ممتاز مزاح نگار اور مولانا محمد علی مرحوم کے رفیق و ہمدم سید محفوظ علی بدایونی کے مجموعہ مضامین طنزیات و مقالات پر تبصرہ کیا ہے، یہ مجموعہ چند برس قبل پاکستان سے شائع ہوا تھا، جگر بریلوی اور حفیظ جالندھری کا ذکر بھی ہے، مصنف نے اکثر ادیبوں کی شخصیت اور کارناموں کے کسی خاص پہلو ہی کو موضوع بحث بنایا ہے، مگر اس کے باوجود ہر ایک کی مجموعی اہمیت اور مختلف النوع خدمات پر بھی مناسب انداز میں روشنی ڈالی ہے، یہ سب مضامین ادبی حیثیت سے مفید اور دلچسپ معلومات پر مشتمل ہیں۔

دولت اور رغبت اسلام کی نظر میں: مرتبہ، مولوی جمیل احمد نذیری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۵۲، قیمت نو روپیہ پچاس پیسے، پتہ، مکتبہ صداقت مبارک پور، اعظم گڈھ، یو۔پی

اس کتاب میں مال و دولت اور رغبت کے بارہ میں اسلامی نظریہ بیان کیا گیا ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مال و دولت پر گفتگو کی ہے، اس میں دکھایا ہے کہ اسلام رہبانیت اور ترک دنیا کا مخالف ہے اس کے نزدیک دولت اور اس کا حصول دنیا داری نہیں بلکہ حب مال اور حب دنیا میں مستغرق ہو جانا دنیا داری ہے، وہ حلال کمائی کی تلقین کرتا ہے، اور حرام کمائی

اور زراندوزی کی ممانعت کرتا ہے، اس سلسلہ میں انفاق کی فضیلت و برکت واضح کی ہے اور اسراف اور فضول خرچی کی کراہت و شناعت دکھائی ہے، دوسرے حصہ میں غربت و ناداری کی بحث ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت پر عموماً پہلے فقرا نے لبیک کہا ہے، پھر دنیا کی تحقیر، ہوس کی مذمت، زہد فی الدنیا اور قناعت و توکل کی فضیلت بیان کی ہے، اور مال و زر کی کمی کو موجب راحت اور کثرت کو باعث فتنہ و فساد بتایا ہے، اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام کی سادگی اور فقر کے واقعات بھی لکھے ہیں اور فقیروں کی تذلیل و اہانت کو خدا کی ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے، اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ دولت بذات خود قبیح نہیں ہے بلکہ اس کا غلط استعمال قبیح ہے، اور گو اسلام نے معاشی مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا ہے تاہم اس کے نزدیک انسان کا اصل مسئلہ معاد کا ہے اسلئے آخرت کی فکر، عقائد و اعمال کی درستگی اور دینی و ایمانی تشخص کو برقرار رکھنے پر مسلمانوں کو مکمل دھیان دینا ضروری ہے۔

تاریخ ادبیات گورکھپور، مرتبہ ڈاکٹر سلام سندیلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی امام باڑہ پورب پھاٹک محلہ میاں بازار گورکھپور (یو پی)۔

گورکھپور لکھنو اور دلی جیسا ادبی مرکز تو نہیں تھا، مگر جو ادیب و شاعر یہاں پیدا ہوئے یا اس سے مدتوں وابستہ رہے ان کی خدمات ادب کم اور غیر اہم نہیں ہیں علاوہ ازیں کئی اردو اخبار و رسالے بھی یہاں سے نکلے، زیر نظر کتاب کے پانچ ابواب میں گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، پہلے اس کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، پھر فارسی نظم و نثر میں گورکھپور کی مختصر خدمات دکھائی گئی ہیں، تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب گورکھپور کی اردو شاعری اور نثر نگاری کا حال اور ان شاعروں اور ادیبوں کا مختصر تذکرہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں یا اس سے قبل پیدا ہوئے اور جو شاعر و ادیب اسکے بعد پیدا ہوئے انکا صرف نام گنا دیا ہے، آخری باب گورکھپور کی اردو صحافت کیلئے خاص ہے اس میں تقریباً تیس اردو اخبار اور رسالوں کے متعلق معلومات درج ہیں، جو وہاں سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، یہ کتاب گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر خاکہ بھی ہے اور وہاں کے معروف و غیر معروف ۶۹ ارباب شعر و ادب کا مختصر تذکرہ بھی، لائق مصنف نے شاعروں کے اشعار اور نثر نگاروں کی تحریریں بھی نمونۃً نقل کی ہیں تاکہ انکے ادبی درجہ و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکے، ڈاکٹر سلام سندیلوی کی یہ ادبی خدمت قابل تحسین ہے، مگر انھیں اعتراف ہے کہ یہ نقش اول ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین